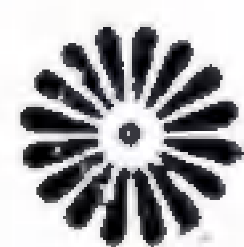
توحیدِ عملی

اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین

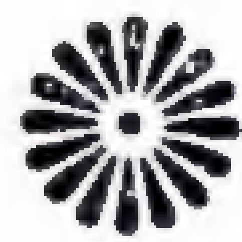
کی اہمیّت و فرضیّت

سورۂ زمر تا سورۂ شوریٰ کی روشنی میں



ڈاکٹر اسرار احمد — امیر تنظیم اسلامی

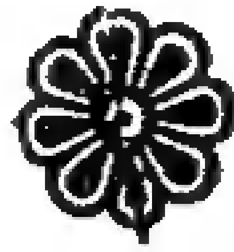
کا خطاب اور درس قرآن حکیم



ترتیب و تسوید

جمیل الرحمٰن

مکتبہ تنظیمِ اسلامی



بار اوّل —— مارچ ۱۹۸۵ء —— ۳۳۰۰

ناشر —— قیم تنظیم اسلامی

مطبع —— مکتبہ جدید شارع فاطمہ جناح لاہور

قیمت —— ۱۵/= روپے

مقامِ اشاعت

مکتبہ تنظیم اسلامی

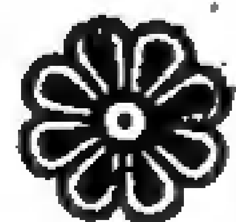
۳۶ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴

فون: ۸۵۲۶۸۳ ، ۸۵۲۶۱۱

کراچی آفس

۱۱ داؤد منزل نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی ۱

فون برائے رابطہ: ۲۱۴۷۰۹



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ رب العٰلمین والعاقبۃ للمتقین
والصلوٰۃ والسلام علیٰ خیر خلقہٖ محمدن الامین
وعلیٰ اٰلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی ۷ دسمبر ۸۳ء سے ۱۹ دسمبر ۸۳ء تک خطابات، درسِ قرآن حکیم اور تنظیم اسلامی کے ایک تربیتی پروگرام کے ضمن میں کراچی میں مقیم رہے ـــــ اس دوران شریف آباد فیڈرل بی ایریا عقب الاعظم اسکوائر میں امیرِ موصوف نے ۱۳ تا ۱۵ دسمبر ۸۳ء کو بعد نمازِ عشاء علاقہ کی وسیع و عریض مسجد جامع مسجد الصفا میں پہلے دن ایک عمومی خطاب فرمایا اور بقیہ دو دن سورۃ شوریٰ کے بعض مقامات کا درس دیا اور اس امر کو واضح فرمایا کہ فریضۂ اقامتِ دین، توحید فی العلم اور توحید فی العمل کا ذروہ سنام (چوٹی) ہے ـــــ اس خطاب میں یہ مضمون سورۃ زمر، سورۃ مومن، سورۃ حٰمٓ السجدہ سے سورۃ شوریٰ کی طرف بتدریج آگے بڑھتا ہے ـــــ فریضۂ اقامتِ دین کے موضوع پر امیرِ محترم کے متعدد خطابات اور دروس ہو چکے ہیں۔ لیکن اس عاجز کے خیال میں اس موضوع پر موصوف کا یہ خطاب اور درس چوٹی کا درجہ رکھتا ہے۔ اور بالکل نئے اسلوب سے دیا گیا ہے، طرزِ استدلال بھی نیا ہے۔

لہٰذا اس عاجز نے کیسٹ سے منتقل کر کے اس خطاب اور پہلے درس کو معمولی حک و اضافہ اور ذیلی و ضمنی سرخیوں کے ساتھ ماہنامہ "میثاق" میں سات اقساط میں شائع کیا اور اب اللہ تعالیٰ کی توفیق، نصرت اور تائید کے طفیل سے خطاب اور دونوں دروس کو

کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے — وَمَا توفیقی اِلّا باللّٰہ

اس خطاب اور درس میں جہاں اقامتِ دین کی فرضیت واضح اور مبرہن ہو کر سامنے آتی ہے وہاں اس عظیم ترین فرض کی ادائیگی کے لئے جو تنظیم قائم ہو اس کے رفقاء میں جو اوصاف اور خصائص مطلوب ہیں وہ بھی بڑی وضاحت و صراحت کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں جن کو اپنے اپنے اندر پیدا کرنے کی شعوری کوشش کرنا ہر اس رفیق پر لازم و لابدمنہ ہے جو تنظیم سے وابستہ ہے۔

اس خطاب اور ان دروس پر محترم ڈاکٹر اسرار احمد دام اقبالہ حسبِ دستور نظرِ ثانی نہ فرما سکے۔ البتہ اس مرتبہ موصوف کے فرزندِ ارجمند عزیزم ڈاکٹر عارف رشید سلّمہ فیلو قرآن اکیڈمی نے نظرِ ثانی بھی کی ہے اور بڑی عرق ریزی کے ساتھ کتابت کی تصحیح بھی کی ہے۔ جزاہُ اللّٰہ خیرًا واحسن الجزاء۔

جیسا کہ متعدد بار عرض کیا جا چکا ہے کہ خطاب اور درس کو تحریری شکل دینا کافی مشکل کام ہے۔ انتہائی احتیاط کے باوصف ڈاکٹر صاحب کے مدّعا کو تحریری صورت دینے میں زبان و انشاء کی تقصیر رہ جاتی ہے۔ لہٰذا دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے۔ اِن شاء اللہ وہ وقت آئے گا جب امیرِ محترم کے جملہ خطابات و دروس ان کی نظرِ ثانی کے بعد شائع ہو سکیں گے۔ اس طرح ان کی افادیت میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔

امیرِ محترم نے اسی موضوع پر ۵ ستمبر ۸۴ء کو عالی مسجد نواں کوٹ ملتان روڈ، لاہور میں تنظیم اہلِ سنت والجماعت کے چالیسویں سالانہ اجلاس میں بھی خطاب فرمایا تھا۔ اس اجلاس میں تنظیم کے امیرِ محترم حضرت مولانا عنایت اللہ شاہ بخاری دامت برکاتہم بھی بنفسِ نفیس شریک تھے۔ شاہ صاحب دامت برکاتہم دعوتِ توحید اور مشرکانہ و مبتدعانہ اوہام، عقائد اور افعال کی تردید و ابطال کے ضمن میں پاکستان گیر شہرت رکھتے ہیں۔ امیرِ محترم کے خطاب کے بعد شاہ صاحب قبلہ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا تھا ان کو بجنسہٖ اور لفظ بلفظ کیسٹ سے منتقل کر کے صفحاتِ آئندہ میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اللّٰھم ثبت اقدامنا علٰی دینک، اللّٰھم ثبت اقدامنا علٰی طاعتک اللّٰھم ارزقنا شھادۃ فی سبیلک آمین یا ربّ العٰلمین

احقر: جمیل الرحمٰن

۲۷ فروری ۱۹۸۵ء

ارشادات

حضرت مولانا عنایت اللہ شاہ بخاری مدظلہُ العالی

امیر جمیعت اشاعت التوحید والسنہ

حضرت شاہ صاحب مدظلہ نے خطبہ مسنونہ کے بعد سورۃ رعد کی حسب ذیل آیات کی تلاوت فرمائی۔

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط
لَہٗ دَعْوَۃُ الْحَقِّ ط وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ لَا یَسْتَجِیْبُوْنَ
لَھُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا کَبَاسِطِ کَفَّیْہِ اِلَی الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاہُ وَمَا ھُوَ
بِبَالِغِہٖ ط وَمَا دُعَآءُ الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ۝

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب قبلہ نے اپنے موضوع "توحید فی الحقیقت کیا ہے"؟ پر گفتگو سے قبل بطور تمہید فرمایا:۔

"بزرگو! بھائیو! عزیزو! ہمارے محترم و مکرم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ماشاء اللہ ولاحول ولاقوۃ الا باللہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جس خوبی اخلاص، اور سوز اور دردِ دل سے توحید فی العمل ——— یا توحید فی الطلب کو مفصل اور پورے اجزاء کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور پھر الحمد للہ کتاب و سنت کے پورے حوالے سے اور صحیح تشریح سے آپ حضرات تک فصل الخطاب کے ساتھ پیغام حق پہنچایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسے قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میرا یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے جناب محترم کی تقریر سنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے۔ اللہ تعالیٰ دینِ حق پر، دینِ قیم پر، دین خالص پر جناب مکرم کو استقامت اور اخلاص کی نعمت نصیب فرمائے، اور جس ولولے، جس جذبے، جس محنت کے ساتھ یہ رضائے الٰہی کو مقصود بنائے ہوئے دعوت حق کا کام کر رہے ہیں

تبلیغ کا حق ادا کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے اپنوں کی بھی باتیں سن رہے ہیں۔ غیروں کے طعن و تشنیع بھی برداشت کر رہے ہیں۔ اس کام میں وقتاً فوقتاً جو تکالیف اٹھاتے اور جھیلتے ہیں وہ ان کے لئے توشۂ آخرت بنائے اور اللہ تعالیٰ اس دعوت کو کامیاب فرمائے اور ہم سب مسلمانوں کو توفیق دے اور اپنے فضل و رحمت سے ہماری قسمت میں یہ سعادت عطا فرما دے کہ اللہ اللہ جس طرح ڈاکٹر صاحب دل و جان سے کوشش کر رہے ہیں کہ دینِ توحید اجتماعی رنگ میں غالب اور نافذ ہو جائے۔ دین پورے کا پورا قائم ہو۔ اسی طرح ہم بھی اس کام میں لگ جائیں۔ ان کی تو کوشش ہے، محنت ہے۔ ان کے ساتھیوں کی محنت ہے اور کوشش ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو کامیاب فرمائے یہ اس کے ساتھ میں ہے البتہ ہمیں وہ سب کچھ کرنا چاہیے جو ہم سے بن سکے۔ اس کے مصداق تو ہم بنیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور اس کی قدرتِ کاملہ سے کچھ بعید نہیں کہ وہ کامیابی عطا فرما دے۔ اس کے ہاتھ میں ہے کہ: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ صبر و استقامت اسی طرح جاری رہا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کوئی بعید نہیں کہ وہ کامیابی عطا فرما دے۔ ورنہ ایک مسلمان کہلانے والے کا جو فریضہ ہے اس کے لئے تو ماشاء اللہ ڈاکٹر صاحب نے تن من کی بازی لگائی ہوئی ہے۔ یہ محض رسمی الفاظ نہیں بلکہ میرا حقیقی تاثر ہے کہ مجھے ان کی تقریر سن کر الحمد للہ ثم الحمد للہ سب سے بڑی خوشی، سب سے بڑی راحت اور سب سے بڑا اطمینان دل کو ہوا کہ یا اللہ اس دور میں تو نے اپنے فضل و کرم سے کسی کو تو یہ توفیق بخش دی ہے کہ وہ تیرے دین خالص کے لئے، دینِ حق کے لئے اجتماعی طور پر اسے کامیاب بنانے کے لئے کوشش کر رہا ہے۔ اے اللہ! تو اس کو بارآور فرما — مایوسی کے حالات تو ہوں گے۔ لیکن: وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ

رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ۝ اللہ کی رحمت سے مایوسی گمراہی اور کفر ہے۔ وَلَا تَايْـئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ اللہ کی رحمت سے صرف کافر لوگ ہی مایوس ہوتے ہیں۔ باقی کچھ لوگ بعض اوقات کہہ دیتے ہیں کہ موجودہ معاشرے میں اس کام کی کامیابی مشکوک ہے۔ یہ خیال ہی سرے سے غلط ہے۔

دنیا میں کامیابی ہو یا نہ ہو لیکن اللہ کے نزدیک کرنے کا کام یہی ہے میں کون اور ڈاکٹر صاحب کون! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن انبیاء میں سے بعض نبی جن کی صداقت پر، جن کی دیانت پر، جن کی امانت پر، جن کی محنت پر، جن کی دعوت پر، جن کے اخلاص پر، جن کی استقامت پر، جن کی قربانیوں اور ایثار پر کسی کو اعتراض کا موقع نہیں مل سکتا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی پاک نے فرمایا کہ ان میں سے کسی کے ساتھ دو اور کسی کے ساتھ ایک امتی ہوگا جنہوں نے دعوت کو پوری طرح قبول کیا ہوگا اور کسی کے ساتھ ایک بھی نہیں"۔ یہ تو حدیث ہے اور صحیح ہے۔ اللہ اللہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کا شکوہ نقل فرمایا ہے: رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّنَهَارًا ۝ اے میرے مالک اے میرے آقا اور مختار میں نے خالص توحید اور صرف تیری عبادت کی دعوت دی اور اس کام کے لئے میں نے نہ رات چھوڑی نہ دن چھوڑا لیکن نتیجہ! فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا یہ میری دعوت سن کر راتوں کو بھی بھاگ کھڑے ہوتے اور دن کو بھی۔ آگے آیا کہ ثُمَّ اِنِّيْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝ میں نے مجلسوں میں اعلانیہ بھی دعوت دی۔ جیسے ڈاکٹر صاحب نے آپ حضرات کے سامنے دعوت پیش کی۔ اور میں نے پوشیدہ ایک ایک کے پاس جا کر بھی دعوت دی تاکہ مجلس میں بات سمجھ میں نہ آئی ہو تو اس طرح آ جائے۔ الغرض دعوت

پہنچانے میں میں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ نہ رات چھوڑی نہ دن چھوڑا۔ نہ اعلان چھوڑا نہ اسرار چھوڑا۔ اپنا تمام آرام تج دیا۔ ڈاکٹر صاحب محترم کا نام بھی آگیا۔ لیکن ان کی ساڑھے نو سو سال کی دعوت پر کتنے لوگ ایمان لائے! کتنے لوگوں نے اسے قبول کیا! اللہ تعالیٰ کی شہادت ہے کہ نوح علیہ السلام کے اخلاص میں ان کی استقامت میں، ان کے ایثار، ان کی صداقت میں، ان کی شجاعت میں نہ کمی تھی نہ کسی کو شک تھا۔ لیکن اللہ کی شہادت سن لو کہ اس سب کا نتیجہ کیا نکلا! وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِیْلٌ ۝ "بہت ہی تھوڑے آدمی ان پر ایمان لائے" انہوں نے اللہ کے حکم سے جو کشتی بنائی وہ کتنی بڑی ہوگی! آپ خود تصور کریں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ کل اسّی افراد تھے۔ ذرا سوچو کہ ساڑھے نو سو برس کی دعوت کا نتیجہ یہ تھا۔ اگر فی برس ایک آدمی بھی دعوت قبول کرتا تو ساڑھے نو سو تو آتے۔ چلو دس دس برس میں ایک آدمی آتا تو بھی پچانوے ۹۵ تو ہوتے لیکن بعض روایات میں اسّی سے بھی کم تعداد آئی ہے۔ کل ہم چالیس افراد۔ ایک اور روایت بھی ہے جس میں نو افراد کی تعداد بیان ہوئی ہے۔ اللہ اللہ، کام کرنے والا یہ نہ سوچے کہ میرے ساتھ لوگ آتے ہیں یا نہیں آتے۔ دیکھنے والے بھی یہ نہ سوچیں کہ اس کے ساتھ فلاں بزرگ ملے یا نہیں ملے۔ یہ دیکھو کہ کام صحیح ہے، کتاب و سنت کے مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قرآن کے مطابق ہے۔ نبی اکرم علیہ السلام کے ارشادات گرامی کے مطابق ہے تو چشم ما روشن دل ما شاد، پھر قبول کرنا چاہیئے۔ زیادہ لوگ ہوں یا نہ ہوں۔ اس میں اعلیٰ قسم کے لوگ ہوں یا نہ ہوں۔ وہ معاملہ نہ ہو جو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے آنجناب کیساتھ کیا تھا۔ وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِیْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ "اے نوح ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے سردار لوگ، بڑے بڑے ذہین لوگ، بڑے بڑے با وجاہت لوگ وہ تو تیرے ساتھ آئے نہیں، ہماری قوم کے کچھ ادنیٰ لوگ کم عقل اور بے وقوف لوگ ہیں جو تیرے پیچھے لگ گئے ہیں۔۔۔ اللہ واللہ میں آپ لوگوں کو مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ ڈاکٹر صاحب کی دعوت کا ساتھ دیں۔ اس میں ہماری دنیا اور عاقبت کی بھلائی ہے"

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم — امّا بعد :

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم   بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ
وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَ
لَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ اللَّهُ يَجْتَبِي
إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ ﴿۱۳﴾

(صدق اللہ العظیم)

اللّٰھم ربنا الھمنا رشدنا واعذنا من شرور انفسنا - اللّٰھم
ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہٗ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہٗ -
اللّٰھم وفقنا لما تحب وترضیٰ — امّا بعد : رب اشرح لی
صدری ویسرلی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی

آمین یارب العٰلمین

حضرات وخواتین! آپ کو اعلانات سے معلوم ہو چکا ہے کہ ہمارا پروگرام یہ ہے کہ آج، کل اور پرسوں تین دنوں میں سورہ شوریٰ کے بعض منتخب مقامات کا مطالعہ کریں گے۔ سورہ شوریٰ کے متعلق اعلانات سے یہ بات بھی آپ کے سامنے آ چکی ہے کہ میرے حقیر مطالعہ کی رو سے یہ سورہ مبارکہ اقامتِ دین کے خاص موضوع پر ایک چوٹی کا درجہ رکھتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض سورتوں کیلئے ذروۂ سنام کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی مختلف سورتیں مختلف موضوعات پر چوٹی کے مقام کی حامل ہیں۔ انگریزی میں اسے اس موضوع کے (CLIMAX) یعنی نقطۂ عروج سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ میرے نزدیک اقامتِ دین کے اس موضوع پر اس سورۂ مبارکہ کو ذروۂ سنام کا مقام حاصل ہے۔

مصحف کی ترتیب آج میں چاہتا ہوں کہ سورۂ شوریٰ کے پیش نظر بعض مقامات کے درس سے قبل اس سورت کے بارے میں اور قرآن کی موجودہ ترتیب کے متعلق بعض اہم اور بنیادی باتیں آپ کے گوش گزار کر دوں جو ان شاء اللہ العزیز قرآن حکیم کے مطالعہ اور اس میں غور و فکر اور تدبر کے لئے قرآن مجید کے ہر طالب علم اور قاری کے لئے مفید ثابت ہوں گی۔

مکیات و مدنیات یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ سورہ شوریٰ مکی سورت ہے۔ آپ اس بات سے بھی واقف ہوں گے کہ قرآن مجید کا تقریباً دو تہائی حصہ مکی سورتوں پر اور بقیہ تقریباً ایک تہائی حصہ مدنی سورتوں پر مشتمل ہے ۔۔۔ ایسا نہیں ہے کہ قرآن مجید میں پہلے مکی اور بعد میں مدنی سورتیں یکجا جمع کر دی گئی ہوں ۔۔۔ پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ مکیات اور مدنیات میں جو نزولی ترتیب ہے اس کے اعتبار سے قرآن حکیم کو مرتب کیا گیا ہو ۔۔۔ یہ بات قرآن مجید کے ہر طالب علم کو معلوم ہے کہ نزولی ترتیب اور ہے اور مصحف کی ترتیب اور ہے۔

ازلی و ابدی ترتیب البتہ یہ بات جان لیجئے کہ اصل میں قرآن حکیم کی ازلی و ابدی ترتیب یہی ہے جو مصحف کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ یہی ترتیب توقیفی ہے اور قرآن مجید کی یہی ترتیب لوح محفوظ کے مطابق ہے۔ البتہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید کا جو نزول ہوا ہے' وہ ایک دوسری ترتیب سے ہوا ہے۔ اُن خاص حالات کے مطابق ہوا ہے جو اُن حضورؐ کی دعوت اور آپؐ کی جد و جہد کے دوران آپؐ کو مختلف مواقع پر مختلف مراحل میں پیش آئے۔ لہٰذا ترتیب نزولی کا تعلق خاص حالات سے اور خاص زمانے سے ہے۔ گویا خاص زمان و مکان اس نزول کے پس منظر میں ہیں لیکن جس ترتیب سے قرآن مجید نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امت کو عطا فرما کر دنیا سے تشریف لے گئے ہیں وہ لوح محفوظ کی ترتیب کے عین مطابق ہے اور یہ ہے ازلی و ابدی ترتیب ۔۔۔ اسی کے مطابق آنحضورؐ کی وفات سے قبل کے رمضان المبارک میں حضرت جبرئیل نے آپؐ کو دوبار قرآن مجید کا دَور کرایا تھا۔

قرآن مجید کا نظم قرآن فہمی اور خاص طور پر اس میں تدبر کے لئے مصحف کی موجودہ ترتیب اس کے نظم اور سورتوں کے باہمی ربط و تعلق کو سمجھنا بہت اہم ہے۔ چنانچہ اس پر ہر دور میں کچھ نہ کچھ کام ہوتا رہا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید اور اس کی سورتوں کا جو اندرونی نظام اور ان کا جو باہمی ربط و تعلق ہے' اس پر برصغیر ہند و پاک کی ماضی قریب کی ایک متقی و متدین شخصیت نے نہایت عمیق تدبر و تفکر کیا ہے اور اس نظام اور باہمی ربط و تعلق

کو واضح کرنے کے لئے انتہائی قابلِ قدر کام کیا ہے۔ یہ شخصیت تھے مولانا امام حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ جن کا انتقال سن ۱۹۳۰ء میں ہوا۔ مولانا مرحوم شبلی نعمانی مرحوم کے بہت قریبی عزیز تھے۔ ان دونوں کے مابین ماموں زاد اور پھوپھی زاد بھائیوں کا رشتہ تھا۔ مولانا فراہیؒ نے عربی زبان میں قرآن مجید کے چند اجزاء کی تفسیر بھی لکھی تھی۔ اس کا نام ہی مولاناؒ نے "تفسیر نظام القرآن" تجویز کیا تھا۔ اس کا مقدمہ مولاناؒ نے "مقدمہ تفسیر نظام القرآن" کے عنوان سے تحریر کیا تھا جو نہایت اہمیت کا حامل اور میرے نزدیک قرآن فہمی کے لئے بمنزلہ کلید ہے۔ پس مولانا فراہیؒ ہی اس دور کی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے قرآن کے نظام پر خصوصی طور پہ توجہات کو مرتکز کیا۔

نظام کے لحاظ سے قرآن کے گروپ

مولانا فراہیؒ کے اصولوں پر نظام قرآن کو واضح کرنے کے لئے انؒ ہی کے شاگردِ رشید مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اس ضمن میں ایک رائے ظاہر کی جو خاصی وزنی ہے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ قرآن حکیم کی جملہ سورتیں سات گروپوں میں منقسم ہیں اور ہر گروپ کی تشکیل اس طرح ہے کہ اس کے آغاز میں ایک یا ایک سے زائد مکی سورتیں ہیں اور ہر گروپ کا اختتام ہوتا ہے ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتوں پہ ــــ اس طرح مکیات اور مدنیات مل کر ایک گروپ بن جاتا ہے ــــ پھر مکیات اور مدنیات پر مشتمل دوسرا گروپ مکمل ہوتا ہے۔ وقس علیٰ ذٰلک ــــ اس طرح قرآن حکیم کے جو سات گروپ بنتے ہیں ان میں سے ہر گروپ کا ایک اپنا مرکزی مضمون ہوتا ہے جسے وہ 'عمود' کہتے ہیں۔ عمود کی یہ اصطلاح شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اختیار فرمائی ہے۔ لیکن یہ کہ قرآن کے سات گروپ ہیں اور ہر گروپ کا اپنا ایک عمود یعنی مرکزی مضمون ہے تو یہ مولانا اصلاحی کی اپنی تحقیق اور تدبر کا نتیجہ ہے جو اس دور میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ مولانا اصلاحی کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ ہر گروپ کے مرکزی مضمون یا عمود کے دو رُخ ہیں ــــ (جیسے ہم کہتے ہیں تصویر کے دو رخ) ــــ ایک رُخ مکیات میں بیان ہوتا ہے اور دوسرا رُخ مدنیات میں اور اس طرح یہ دونوں رُخ مل کر اس گروپ کے عمود یا مرکزی مضمون کی تکمیل کر دیتے ہیں۔

اس طرح جو سات گروپ بنتے ہیں۔ ان میں سے پہلے گروپ میں مکی سورت صرف ایک ہے اور وہ ہے سورۃ فاتحہ ــــ یہ سورت مختصر ہے اور صرف سات آیات پر مشتمل ہے، اگرچہ اپنے مضامین کی جامعیت کے اعتبار سے اسے 'قرآنِ عظیم' بھی کہا گیا ہے

گویا یہ سورہ خود اپنی جگہ ایک مکمل قرآن ہے ۔ اسے اُمّ القرآن بھی کہا گیا اور اساس القرآن بھی ـــ اس کو شافیہ اور کافیہ کے ناموں سے بھی موسوم کیا گیا۔ اس سورہ کے مختلف نام اس کی جامعیت و عظمت کے اظہار کے لئے رکھے گئے ہیں۔ حالانکہ حجم کے اعتبار سے وہ بہت چھوٹی سورت ہے جبکہ اس پہلے گروپ میں چار نہایت طویل مدنیات شامل ہیں یعنی سورۃ بقرہ سورۃ آلِ عمران، سورۃ نساء اور سورۃ مائدہ گویا قرآن مجید کے تقریباً چھ پارے ـــ ان چار سورتوں پر مشتمل ہیں ـــ دوسرے گروپ میں دو بڑی مکی سورتیں انعام اور اعراف اور اسی طرح دو بڑی مدنی سورتیں انفال اور توبہ شامل ہیں ـــ تیسرے گروپ میں پہلی چودہ سورتیں سورہ یونس سے سورۃ مومنون تک مکی ہیں اور آخر میں صرف ایک مدنی سورت " سورہ نور" شامل ہے یہ بھی چھ پاروں کے لگ بھگ گروپ بنتا ہے ـــ چوتھا گروپ سورۃ فرقان سے سورۃ احزاب پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں بھی ابتدا میں آٹھ مکی سورتیں ہیں اور آخر میں صرف ایک مدنی سورت سورۃ احزاب' ہے ـــ پانچواں گروپ سورۃ سبا سے شروع ہو کر سورۃ حجرات پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں ابتدا میں تیرہ مکی سورتیں اور اختتام پر تین مدنی سورتیں شامل ہیں ـــ پھر چھٹا گروپ سورہ قٓ سے شروع ہو کر سورہ تحریم پر ختم ہوتا ہے اس میں پہلی سات سورتیں مکی اور اس کے بعد سورۃ حدید سے لے کر سورۃ تحریم تک دس سورتیں مدنی ہیں۔ یہ وہ واحد گروپ ہے جس میں مدنیات کی تعداد مکیات سے زیادہ ہے ـــ آگے چلیے پھر سورہ الملک سے سورہ الناس تک ساتواں گروپ ہے۔ اس گروپ میں چند سورتیں مستثنیٰ ہیں جو مدنی ہیں باقی کل کی کل سورتیں مکیات پر مشتمل ہیں ۔

مکیات کے مرکزی مضامین و موضوعات

اب ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ مکیات کے مرکزی مضامین و موضوعات کیا ہیں۔! اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ مکی سورتوں کا اصل موضوع ہے ایمان ـــ پہلے اسی کو پختہ کیا گیا ہے اس لئے کہ ایمان پر ہی اسلام کا دار و مدار ہے۔ ایمان کی حیثیت جڑ کی ہے اور اسلام کی حیثیت درخت کی ہے ۔ اور اعمال صالحہ اسی ایمان اور اسلام کے ثمرات ہیں ۔ لہٰذا بنیادی حیثیت جڑ ہی کو حاصل ہوتی ہے جس پر درخت قائم ہوتا اور برگ و بار لاتا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ جیسے ایک عمارت ہے اس کی ایک بنیاد ہے اور اس پر تعمیر ہے۔ نظر تو عمارت آتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس عمارت کے استحکام کا سارا دار و مدار بنیاد پر ہے اور وہ زیرِ زمین ہے نظر نہیں آتی ـــ پس

معلوم ہوا کہ اصل شئے ایمان ہے ۔ یہ ایمان ہی اصل موضوع ہے ۔ تمام مکی سورتوں کا ۔

ایمان کے اہم اجزاء

البتہ ایمان کے تین اجزاء ہیں ۔ ایمان باللہ یا توحید ۔ ایمان بالرسالت اور ایمان بالمعاد یا ایمان بالآخرۃ ۔ ان تینوں اجزاء کی مکی سورتوں میں مختلف اسالیب سے دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تفہیم ہے لہذا مکیات کا سب سے بڑا موضوع تو ہو گیا ایمان ۔

بنیادی اخلاقیات

دوسرا بڑا اور اہم مضمون مکی سورتوں کا بنیادی اخلاقیات سے متعلق ہے ۔ سچائی ، ہمدردی ، بھوکوں کو کھانا کھلانا ، یتیموں سے حسن سلوک ، حاجت مندوں کی دستگیری ، ماپ اور تول میں دیانت ، معاملات میں امانت ، ایفائے عہد ، صلہ رحمی ، والدین سے حسن سلوک ، زنا سے اجتناب ، عصمت و عفت کی حفاظت ، تبذیر و اسراف سے بچنا ، چغل خوری بہتان تراشی ، شیخی و تکبر اور تفاخر و تکاثر سے پرہیز ، قتل ناحق بالخصوص نومولود بچیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے پر نکیر ، غلاموں پر شفقت یا ان کی آزادی کی ترغیب وغیرہ وغیرہ ۔ ان اخلاقیات کی تعلیم و تلقین کا بھی کثرت سے مکیات میں مختلف اسالیب سے شد و مد کے ساتھ ذکر ہے ۔ مکی سورتوں میں ان چیزوں پر آپ کو زور (EMPHASIS) ملے گا ۔ مکیات میں آپ کو شریعت کے احکام نہیں ملیں گے ۔ حلال و حرام کیا ہے ؟ ان کا ذکر مدنی سورتوں میں آئے گا ۔ مکیات میں ایمان کی دعوت کے ساتھ ساتھ بنیادی اخلاقیات کی تعلیم و تلقین بھی ملے گی ۔ ان اخلاقیات کی جو مکہ والوں کے نزدیک بھی متفق علیہ تھے اور کوئی انسان کبھی دنیا میں ایسا نہیں ہوگا جو یہ تسلیم نہ کرے کہ سچ بولنا اچھا ہے ، جھوٹ بولنا برا ہے ۔ کوئی انسان ایسا نہیں ہوگا جو یہ نہ کہے کہ وعدہ وفا کرنا اچھائی ہے اور وعدہ خلافی برائی ہے ۔ وقس علیٰ ھذا ۔ تو معلوم ہوا کہ دنیا کے متفق علیہ اخلاقی اصول اور اقدار کی تعلیم و تلقین بھی ہے جو آپ کو مکی سورتوں میں ایمان کی دعوت کے ساتھ ملے گی ۔

قصص الانبیاء و انباء الرسل

تیسرا بڑا مضمون جو مکی سورتوں میں ہے وہ ۔ انبیاء و رسل کے حالات و واقعات ہیں ۔ ان میں بھی ایک فرق ہے ۔ انبیاء کرام (علیہم السلام) کے جو واقعات و حالات بیان ہوئے ہیں ، وہ بنیادی اخلاقیات کے ذیل میں آئے ہیں ۔ رسولوں (علیہم السلام) کے جو واقعات و حالات آئے ہیں ، وہ اس کام کے لئے آئے ہیں جن کو امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے " التذکیر بایام اللہ " کا عنوان دیا ہے یعنی یاد دہانی کرانا اللہ کے دنوں کے حوالے سے ۔ گویا جن قوموں کی طرف اللہ کے رسول مبعوث ہوئے اور ان قوموں

نے ان رسولوں کی دعوت توحید کو قبول نہیں کیا، اسے رد کر دیا تو وہ قومیں ہلاک کر دی گئیں ـــ نسیاً منسیاً کر دی گئیں۔ ان کا نام و نشان مٹا دیا گیا۔ جیسے قوم نوح، قوم ثمود، قوم عاد، قوم لوط، قوم شعیب اور آل فرعون وغیرہ ـــ ان چھ اقوام کا ذکر بار بار قرآن مجید میں آیا ہے۔ جو حضرات قرآن حکیم کو پڑھنے والے ہیں ان کو معلوم ہے کہ ان چھ رسولوں کا ذکر جو ان قوموں کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے یعنی حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہم السلام ـــ مختلف اسالیب اور مختلف سیاق و سباق میں اس اعتبار سے تکرار و اعادہ کے ساتھ مکی سورتوں میں آتا ہے کہ ان کے حالات تمہارے لئے مثال و نشانِ عبرت ہیں ان سے سبق لو کہ ان رسولوں کی قوموں نے ان کی دعوت کو قبول نہ کیا تو وہ ہلاک کر دی گئیں ـــ اگر تم نے بھی ان ہی کا سا رویہ اختیار کیا تو تم اس دنیا میں بھی عذاب الٰہی سے دوچار ہو گے اور آخرت میں بھی عذابِ دائمی تمہارا مقدر ہو گا۔

جن حضرات کو مطالعۂ قرآن سے دلچسپی ہے میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر ان کے لئے دو اصطلاحات کا فرق بھی واضح کر دوں ـــ ایک اصطلاح ہے "قصص النبیین"۔ نبیوں کے حالات کو قصص قرار دیا گیا ہے۔ رسولوں کے حالات کے لئے دوسری اصطلاح آتی ہے اور وہ ہے "انباء الرسل" ـــ انبا، بڑی اہم خبر کو کہتے ہیں۔ انباء الرسل کے معنی ہوں گے "رسولوں کی بہت اہم خبریں"۔ یعنی پوری پوری قوموں کا ہلاک کر دیا جانا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا، جن کے متعلق قرآن مجید کہتا ہے: كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا "وہ ایسے ہو گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں، کبھی بستے ہی نہیں تھے"۔ لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ "اب ان کے مسکن رہ گئے ہیں، کھنڈرات ہیں، ان میں بسنے والے کہیں نظر نہیں آتے"۔ کہیں فرمایا: فقطع دابر القوم الذین ظلموا ـــ "ان ظالم قوموں کی جڑ کاٹ دی گئی"۔ یہاں یہ بھی نوٹ کر لیجئے کہ قرآن میں "ظلم" کا لفظ عموماً شرک کے لئے استعمال ہوا ہے۔ جیسے: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ـــ معلوم ہوا کہ یہ بڑے اہم واقعات ہیں تو ان کو قرآن کہتا ہے "اَنْبَاۗءُ الرُّسُلِ" ـــ اور جن انبیاء کرام کے واقعات و حالات میں ان قوموں کی ہلاکت کا ذکر نہیں ہے بلکہ ان نبیوں کے مضبوط کردار، ان کی پاکیزہ سیرت، ان کی صداقت و دیانت، ان کی امانت، ان کی عصمت، ان کی عفت اور ان کے صبر و ثبات کا ذکر ہے۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے واقعات و حالات سورۂ یوسف میں بیان ہوئے ہیں تو ان کو قرآن کہتا ہے قصص ـــ سورۂ یوسف میں الفاظِ مبارکہ ہیں:

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ — اور سورۂ ھود کے آخر میں آتا ہے کہ یہ انباء الرسل ہیں جو ہم اے نبی! آپؐ کو سنا رہے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ سے (اے نبیؐ) ہم آپؐ کے دل کو جما دیں اور تسلی دیں اور (اے نبیؐ) اس سورت میں آپؐ کے پاس حق آیا ہے اور اس میں نصیحت اور یاد دہانی ہے ایمان والوں کیلئے الفاظ مبارکہ ہیں وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ ھٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ یعنی جن حالات سے اے نبیؐ! آپؐ کو اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کو دوچار ہونا پڑ رہا ہے وہی حالات سابقہ رسولوں کو بھی پیش آئے تھے لیکن بالآخر اللہ کی نصرت ان رسولوں کے شامل حال ہوئی، وہ سربلند ہوئے اور وہ قومیں جنہوں نے ان کی تکذیب کی، ان کا استہزاء کیا، تمسخر کیا، ان کی دعوتِ ایمان سے اعراض کیا وہ ہلاک و برباد کر دی گئیں۔

میں نے جن تین اہم مضامین کا ذکر کیا ہے اکثر و بیشتر مکّی سورتوں میں مشترک ہیں، ان کا اعادہ کر لیجئے یعنی نمبر ایک: دعوتِ ایمان — ایمان میں توحید، رسالت اور آخرت — نمبر دو: بنیادی اخلاقیات کی تعلیم و تلقین — نمبر تین: قصص النبیین، جن کا تعلق بنیادی اخلاقیات سے ہے اور انباء الرسل، جن کا تعلق دعوتِ ایمان سے ہے — یہ ہیں مکیات کے بنیادی مضامین۔

گروپوں میں مضامین کی تقسیم

البتہ ان میں ایک اور تقسیم بھی ہے۔ میں نے مکّی سورتوں کے جو گروپ آپ کو گنوائے تھے ان میں سے پہلے گروپ میں صرف مکّی سورت، سورۂ فاتحہ ہے، وہ تو پورے قرآن کیلئے بمنزلہ دیباچہ اور مقدمہ ہے۔ اس کے بعد اس گروپ میں پانچ مدنی سورتیں ہیں۔ باقی رہ گئے چھ گروپ — ان میں آپ دیکھیں گے کہ دوسرے اور تیسرے گروپ کی مکّی سورتوں میں زیادہ زور ایمان بالرسالت پر ہے۔ سورۂ انعام و سورۂ اعراف جو دوسرے گروپ کی مکیات ہیں ان میں اور تیسرے گروپ میں سورۂ یونس سے لے کر سورۂ مومنون تک — ویسے جو تین بنیادی مضامین میں نے گنوائے ہیں وہ بھی ان مکّی سورتوں میں ملیں گے لیکن ان گروپوں کی سورتوں میں خاص زور (EMPHASIS) رسالت پر ملے گا۔ ان کا اصل عمود اور مرکزی مضمون رسالت ہے۔ اس کے بعد چوتھے گروپ میں سورۂ فرقان سے لے کر سورۂ حٰمٓ السجدہ تک آٹھ سورتیں۔ پھر پانچویں گروپ میں سورۂ سبا سے لے کر سورۂ احقاف تک تیرہ سورتیں ہیں۔ ان اکیس سورتوں کا مرکزی مضمون یا عمود توحید ہے۔ ان میں بھی پہلے مضامین موجود ہیں لیکن اصل زور توحید پر ہے۔ آخری جو دو گروپ ہیں

ان میں چھٹے گروپ میں مکیات سورۂ قٓ سے لے کر سورۂ واقعہ تک اور ساتویں گروپ یعنی سورۂ ملک سے جو مکیات کا طویل سلسلہ ہے اس میں چند سورتوں کو چھوڑ کر ان کا مرکزی مضمون یا عمود ہے آخرت کا اِنذار، آگاہ کرنا، خبردار کرنا کہ یہ دنیا فانی ہے۔ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ جس میں اس دنیا کی زندگی کے تمام اعمال ہی کا نہیں بلکہ نیتوں اور ارادوں کا بھی حساب کتاب ہوگا۔ جواب دہی کرنی ہوگی پھر عدالتِ الٰہی سے جزا و سزا کے فیصلے صادر ہوں گے۔ یا جنت ہوگی ہمیشہ کے لئے یا آگ ہوگی دائمی ــــ ان ہی گروپوں میں یہ سورتیں ملتی ہیں: اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝ کہیں فرمایا: اَلْحَآقَّةُ ۝ مَا الْحَآقَّةُ ۝ کہیں آگاہ کیا گیا: اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ اسی طرح ہے: عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝ اور هَلْ اَتٰكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ۝ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝ ــــ تو آخری دو گروپوں کی مکیات میں زیادہ زور ہے انذارِ آخرت پر ــــ درمیانی دو گروپوں کا مرکزی مضمون ہے توحید ــــ اور ابتدائی دو گروپوں کی مکیات میں جس پر زیادہ زور ہے، وہ ہے رسالت ــــ

اب آگے چلئے۔ مجھے اندازہ ہے کہ جن حضرات کو قرآن مجید کی ترتیب سے تعارف نہیں ہے، ان کو یہ باتیں قدرے بھاری معلوم ہوں گی لیکن میں اصل میں یہ تمہید بنا رہا ہوں اور آپ کو رفتہ رفتہ سورۂ شوریٰ کی طرف لا رہا ہوں ــ میں نے ابھی درمیانی جو اکیس سورتیں آپ کو گنوائیں۔ سورۂ فرقان سے لے کر سورۂ حٰمٓ السجدہ تک آٹھ سورتیں ہیں ــــ سورۂ سبا سے لے کر سورۂ احقاف تک تیرہ سورتیں ہیں ــ ان دونوں گروپوں کی ان اکیس سورتوں کا مرکزی مضمون توحید ہے۔

اب ایک عجیب نکتہ آپ کو بتا رہا ہوں وہ یہ کہ ان اکیس سورتوں میں درمیانی سورت کونسی ہوگی! ظاہر ہے کہ گیارہویں۔ دس اِدھر دس اُدھر۔ تو گیارہویں سورت سورۂ یٰسٓ ہے جس کو جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قلب القرآن قرار دیا۔ سورۂ یٰسٓ قرآن کا دل ہے۔ اس لئے کہ اصل موضوع تو توحید ہی ہے۔ ہمارا دین، دین توحید ہے۔ رسالت بھی اسی لئے ہے کہ توحید کی طرف دنیا کو دعوت دے۔ آخرت کا انذار بھی اسی لئے ہے کہ لوگ شرک سے باز آجائیں، اس سے کُلّیۃً اجتناب کریں اور توحید کو اختیار کریں اور صرف اسی کا التزام کریں۔ اور سورۂ یٰسٓ میں یہ تینوں مضامین نہایت جامعیت، بلاغت اور ایجاز و اعجاز کے ساتھ آجاتے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ دین کی اصل، اس کی جڑ، اس کی بنیاد ہے ہی توحید ــــ اس کی رُو سے

سب سے بڑی گمراہی شرک ہے۔ شرک وہ گناہ ہے جس کے بارے میں سورۂ نساء میں دو مرتبہ فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۔۔۔۔ لہٰذا یہ اکیس سورتیں ۔۔۔ توحید کے موضوع پر نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ ویسے تو آیۃ الکرسی ہے سورۂ بقرہ میں جس کو آں حضورؐ نے قرآن کی تمام آیات کی سرتاج قرار دیا ۔۔۔۔ آخری پارے میں سورۂ اخلاص ہے جس کو نبی اکرمؐ نے ایک تلث قرآن کے مساوی قرار دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ توحید کے موضوع پر آیتوں میں سے جامع ترین آیت، آیۃ الکرسی ہے اور سورتوں میں سے جامع ترین سورت سورۂ اخلاص ہے۔ لیکن گروپوں کی حیثیت سے ان اکیس سورتوں کو توحید کے موضوع پر مرکزیت حاصل ہے۔

توحید کے دو حصے

اب میں ایک اہم بات آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ توحید کے دو حصے ہیں۔ یہ بات شاید کچھ حضرات کے لئے اچنبھے والی ہو، لیکن جب آپ میری گفتگو سنیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ یہ بات انوکھی معلوم نہیں ہوگی۔ اس بات کی بنیادیں اور اس کے اجزاء آپ حضرات کے ذہنوں میں موجود ہیں۔ میں ان کو ایک ترتیب سے آپ کے تحت الشعور سے شعور کی سطح پر لانے کی کوشش کروں گا ۔۔۔ یہ بات کہ توحید کے دو حصے ہیں، میں اپنی طرف سے عرض نہیں کر رہا بلکہ یہ بات امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے پیش کر رہا ہوں۔ انہوں نے یہ تقسیم کی ہے اور یہ بڑی پیاری تقسیم ہے ۔۔۔

توحیدِ علمی

امام مرحومؒ کے قول کا حاصل یہ ہے کہ ایک توحید ہے علمی توحید، توحید فی المعرفۃ یا توحید فی العقیدہ ۔۔۔ اللہ کو ایک جاننا، ایک ماننا، اللہ کی ذات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرانا۔ اللہ کی صفات میں کسی کو ساجھی قرار نہ دینا۔ کسی کو اس کا ضد یا ندّ، یا ہم پلّہ، ہمسر یا مدّمقابل نہ بنانا۔ پس توحید فی الذات اور توحید فی الصفات ان دونوں کو جمع کریں گے تو یہ ہوگی علمی توحید۔ معرفتِ الٰہی کی توحید۔ یہ توحید ہوگی عقیدے کی توحید ۔۔۔ دوسری توحید ہے توحید عملی۔ اس کو امام ابن تیمیہؒ نے توحید فی الطلب کا جامع عنوان دیا ہے ۔۔۔ وہ یہ ہے کہ انسان فی الواقع ایک ہی اللہ کا بندہ بن جائے۔ اس کی بندگی اور پرستش صرف اللہ ہی کے لئے خالص ہو جائے جو الاحد ہے ۔۔۔ ایک خطبہ نبویؐ میں الفاظ آتے ہیں: وَحِّدُوا اللّٰہَ فَاِنَّ التَّوْحِیْدَ رَأْسُ الطَّاعَاتِ۔ یہاں "وَحِّدُوْا" بابِ تفعیل سے صیغۂ امر ہے ۔۔۔!

باب تفعیل کا خاصّہ توحید اسی باب تفعیل سے ہے اور تفعیل کا خاصّہ یہ ہے کہ کوئی کام بڑی محنت سے، بڑے اہتمام سے، بڑے استقلال و استقرار سے کیا جاتا ہے تو اس کے لئے لفظ باب تفعیل سے آتا ہے ـــــ جیسے اعلام کے معنی ہیں کسی کو کچھ بتا دینا اور تعلیم کے معنی ہیں کسی کو کچھ سکھانا۔ اب بتانے اور سکھانے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آپ ایک دفعہ بتا کر فارغ ہو گئے۔ اب کوئی سمجھے یا نہ سمجھے اس کے پلّے کچھ پڑے یا نہ پڑے۔ آپ کی ذمّہ داری نہیں ہے۔ ابلاغ کے معنی بھی صرف پہنچانے کے ہیں لیکن تبلیغ کے معنی ہوں گے محنت سے، اہتمام سے، دلیل سے اور تدریج سے کوئی بات کسی تک پہنچانا۔ اب تعلیم اور تبلیغ میں آپ کو سخت مشقت کرنی پڑتی ہے۔ (HAMMER) کرنا پڑتا ہے یا ایک بات کو ذہن میں اتارنا مقصود ہے۔ لہٰذا بات ایک مرتبہ سمجھ میں نہیں آئی تو اسے بار بار سمجھانا پڑے گا۔ اس کی توضیح کرنی ہوگی، تبیین کرنی پڑے گی۔ بڑی محنت سے کسی کے ذہن میں کوئی بات اتارنی اور بٹھانی ہوگی۔ یہ تعلیم ہے۔ اسی طرح محنت لگن کے ساتھ دعوت پہنچانے سے تبلیغ کا حق ادا ہوگا۔ امید ہے کہ اس وضاحت سے اعلام اور ابلاغ اور تعلیم و تبلیغ میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے وہ آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا۔

انزال اور تنزیل کا فرق باب تفعیل کے خاصّے کے متعلق ایک مثال اور پیش کرتا ہوں۔ انزال کے معنی ہیں دفعتاً اتارنا۔ لیکن جب یہ لفظ باب تفعیل میں تنزیل بنے گا تو اس کے معنی ہوں گے تھوڑا تھوڑا کر کے ٹھہر ٹھہر کر تدریج سے اتارنا ـــــ پورا قرآن مجید رمضان میں لیل القدر میں دفعتاً واحدہ لوحِ محفوظ سے اتر کر سمائے دنیا تک آ گیا ـــ یہ ہے انزال ـــ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ اور اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝ اب سمائے دنیا سے آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو نازل ہوا تو وہ بیک وقت نازل نہیں ہوا۔ بلکہ تنزیلاً نازل ہوا۔ الٓمّٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اور وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ سورۂ یٰسٓ میں فرمایا: تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ سورۂ زمر شروع ہوتی ہے اسی تنزیل کے ذکر سے: تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ سمائے دنیا تک قرآن کے نزول کی شان ہے شانِ انزالی اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر نزولِ قرآن کی شان ہے شانِ تنزیلی۔ تھوڑا تھوڑا ضرورت کے مطابق حالات و واقعات کی مناسبت سے قرآن کا نزول یہ تنزیل ہے۔

توحید کیا ہے

باب تفعیل کے خاصے کو پیشِ نظر رکھ کر اب آپ لفظ توحید پر غور کیجئے۔ جس کا مطلب و مفہوم ہوگا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کو ذات و صفات کے لحاظ سے احد ماننا اور جاننا ـــــ آپ کو اندازہ ہوگا کہ توحید اختیار کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ دائمی طور پر اللہ کو ایک جان اور ایک مان کر استقلال و استقرار کے ساتھ اس کی پیہم اطاعت کے لئے محنت کرتے رہنا بڑا مشکل کام ہے۔ اس موقع پر مجھے یہ شعر یاد آرہا ہے کہ ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا ــ مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

پس توحید کے لئے بڑی محنت و مشقت کی ضرورت ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک لکیر کھینچی ہوئی تھی۔ پالا بنا ہوا تھا اور کوئی اِدھر سے اُدھر آگیا تو اسے توحید کی دولت مل گئی ـــ اس طرح اسلام تو مل سکتا ہے یعنی ایک شخص قانونی طور پر مسلمانوں میں شامل ہو جائے گا۔ لیکن یہ کہ وہ موحد بن گیا تو یہ خام خیالی ہے۔ اسی لئے نبی اکرمؐ خطبے میں ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ : وَحِّدُوا اللّٰہَ ـــ اللہ کی توحید واقعتاً اختیار کرو جیسے کہ اس کا حق ہے۔

توحیدِ عملی

زندگی کے عملی میدان میں توحید اختیار کرنا توحید علمی سے بھی زیادہ بڑا مشکل کام ہے۔ اس توحید فی العمل کو امام ابن تیمیہؒ توحید فی الطلب کہتے ہیں۔ یہ بڑی کٹھن وادی ہے۔ اسے عبور کرنا بڑے عزم اور حوصلہ کا کام ہے ـــ یہ توحید عملی درحقیقت پانچویں گروپ میں سورۂ سبا سے لے کر سورۂ احقاف تک کی تیرہ مکی سورتوں میں سے چار سورتوں کا مرکزی موضوع ہے۔ یہ چار سورتیں ہیں۔ سورۂ زُمَر۔ سورۂ مومنؔ۔ سورۂ حٰمٓ السجدہ اور سورۂ شوریٰؔ ـــ ان چار سورتوں میں تدریجاً توحید عملی کا مضمون سامنے آتا ہے ـــ میں بھی اس میں یہ تدریج رکھوں گا کہ میں پہلے سورۂ زمر کی چند آیات آپ کو سناؤں گا۔ پھر سورۂ مومن کی چند آیات۔ پھر سورۂ حٰمٓ السجدہ کی ایک آیت کی طرف آپ کی توجّہ دلاؤں گا۔ پھر ہم مطالعہ کریں گے سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ کا جس کی تلاوت سے آج کی اس گفتگو کا آغاز ہوا ہے۔

توحیدِ عملی کے مدارج

پہلا درجہ: انفرادی توحید

توحیدِ عملی کا پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان کے انفرادی عمل میں توحید آجائے۔ انفرادی شخصیت فی الواقع توحید کے رنگ میں رنگی جائے۔ واقعتاً انسان اللہ کا بندہ بن جائے جیسا کہ اس کا بندہ بننے کا حق ہے۔ پھر اس کی بندگی میں کسی اور کی بندگی کا شائبہ نہ ہو۔ وہ بندگی خالص بندگی ہو اللہ کی ـــ اللہ کے سوا کسی اور کا کہنا مانا

جا رہا ہو۔ اللہ کے حکم کے خلاف کسی اور کا حکم بجا لایا جا رہا ہو تو یہ توحید نہیں ہے۔ بغاوت اور سرکشی ہے۔ طغیان ہے۔ لیکن اگر اللہ کے حکم کے تابع کسی کا حکم مانا جائے اس سے آزاد ہو کر نہ مانا جائے تو یہ توحید ہے۔ اس طرح اگر انسان اپنی انفرادی زندگی میں حقیقی طور پر اللہ کا بندہ بن جائے تو یہ ہے انفرادی توحید عمل کے اعتبار سے ۔۔۔ اسی انفرادی عملی توحید کا ایک اہم پہلو ہے 'توحید فی الدعا'۔۔۔ اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ الدعاء مخ العبادۃ ۔۔۔" دعا ہی عبادت کا جوہر ہے" ایک موقع پر حضورؐ نے ارشاد فرمایا: الدعاء ھو العبادۃ ۔۔۔" دعا ہی اصل عبادت ہے" مطلب یہ ہے کہ انسان حاجت روائی، دستگیری اور اعانت وامداد کے لئے غیب میں سے جس کو پکارتا ہے، وہ ہی اس کا اصل معبود ہے۔ پس توحید فی العبادۃ اور توحید فی الدعا یہ انفرادی توحید کا پہلا درجہ ہے۔

دوسرا درجہ: اجتماعی توحید اب انفرادی سطح اور انفرادی وجود سے جو توحید نکلے گی وہ لازماً متعدی ہو گی۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کئی مرتبہ مثال دی ہے کہ اگر کسی جگہ آگ ہے اور اس میں حرارت ہے تو یہ حرارت آگ میں محدود نہیں رہتی بلکہ وہ ماحول میں سرایت کرتی ہے۔ یا آپ آگ پر کوئی چیز رکھیں گے یا اس میں ڈالیں گے تو وہ چیز بھی گرم ہو جائے گی۔ اسی طرح برف میں ٹھنڈک ہے تو وہ برف تک محدود نہیں رہے گی وہ بھی ماحول میں سرایت کرے گی۔ آپ برف کو پانی میں ڈالیں گے تو برف پانی کو بھی ٹھنڈا کر دے گی، یہ قانون طبعی ہے ۔۔۔ اسی مثال سے سمجھئے کہ اگر کسی فرد کے اندر توحید فی الواقع جاگزین قائم ہو جائے اور وہ راسخ ہو، پختہ ہو، مضبوط ہو اور حقیقی ہو، دھوکے اور فریب کی نہ ہو یعنی بظاہر تو بڑے موحد ہونے کے مدعی ہوں اور باطن یعنی دل میں صنم خانے آباد ہوں تو اس حقیقی اور خالص توحید کو لازماً ماحول میں سرایت کرنا چاہیے ۔۔۔

باطن کے اصنام بُرا نہ مانیئے گا۔ میں اب چند تلخ حقائق آپ کے سامنے لانا چاہتا ہوں ہمارے معاشرے میں کچھ لوگ ہیں جو موحد خالص ہونے کے دعویدار ہیں۔ وہ قبر پرستی اور اس نوع کے مختلف مشرکانہ و مبتدعانہ افعال کی تو بڑی مذمت کرتے ہیں۔ بات بالکل صحیح ہے۔ ان کی مذمت ہونی چاہیئے، یہ کام قطعی غلط نہیں ہے۔ بلکہ مفید ہے لیکن ان میں سے اکثر حضرات کا خیال اور دھیان اس طرف نہیں جاتا کہ دولت پرستی بھی شرک ہے۔ اگر حصولِ دولت میں حلال و حرام کی تمیز ختم ہو گئی تو معلوم ہوا کہ دولت معبود ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا: تعس عبد الدینار وعبد الدرھم۔ "ہلاک ہو جائے دینار اور درہم کا بندہ"۔ اس کا ایک ترجمہ یہ بھی ہوگا کہ "ہلاک ہوگیا دینار و درہم کا بندہ"! غور کیجئے دینار و درہم کا بندہ کون ہے ــــــ! آں حضورؐ نے لفظ کونسا استعمال فرمایا، عبد۔ اس لیے کہ جس شخص کے دل میں دولت کی محبت اتنی ہے کہ وہ اسی تگ و دو میں لگا رہتا ہے کہ دولت ہر حال میں اس کے پاس آنی چاہیئے۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ حلال سے آئے یا حرام سے آئے۔ جائز سے آئے یا ناجائز سے آئے۔ صحیح سے آئے یا غلط سے آئے ــــ دولت کی اس محبت کا مطلب یہ ہے کہ اس کا معبود دولت ہے۔ فرق اتنا ہی ہے کہ ہندوؤں نے دولت کی ایک دیوی تراشی ہوئی ہے جس کا نام انہوں نے لکشمی دیوی رکھ چھوڑا ہے۔ اس کی وہ پوجا کس لئے کرتے ہیں! اس لئے کہ ان کو دولت ملے۔ درحقیقت وہ اس مورتی کے پردے میں دولت کی پوجا کرتے ہیں۔ ہم نے صرف یہ کیا ہے کہ 'لکشمی دیوی' کی کوئی مورتی ہمارے سامنے نہیں ہے لیکن لکشمی دیوی کی پوجا سے ہندوؤں کا جو مقصود ہے وہی ہمارا بھی ہو جائے گا اگر ہم حرام وحلال اور شریعت کی قیود و شرائط سے بے نیاز ہو کر دولت کے حصول میں لگ جائیں تو اس طور پر یہ دولت معبود کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ دولت کے ایسے پجاریوں اور غلاموں کے لئے ہی آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تعس عبد الدینار وعبد الدرھم۔

اسی طریقے سے دیکھیئے۔ ایک طرف اللہ کا حکم ہوتا ہے اور دوسری طرف نفس کی چاہت بڑی سادہ سی مثال ہے۔ صبح سویرے کا وقت ہے۔ آنکھ بھی کھل گئی ہے۔ اذان بھی سنی ہے۔ یہ پکار کس کی ہے؟ مؤذن کی زبان سے ضرور نکلی ہے لیکن پکار اس کی نہیں ہے۔ پکار تو اللہ کی ہے کہ ــــ حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح اور الصلوٰۃ خیر من النوم۔ ــــ علامہ اقبال کا بڑا پیارا شعر ہے جو اس بات کی تفہیم میں ممد ہو سکتا ہے۔

نکلی تو لبِ اقبال سے ہے کیا جانئے کس کی ہے یہ صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی دلِ محفل کا تڑپا بھی گئی

تو زبان بے شک مؤذن کی ہے لیکن صدا تو اللہ کی ہے۔ ایک طرف اللہ کی پکار ہے۔ دوسری طرف نفس کہتا ہے، "سوؤ ــ ابھی آرام کرو"۔ ــ یہ ہے وہ کشمکش جس سے ہم میں سے اکثر لوگوں کا سابقہ پیش آتا ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ ہمیں معلوم نہ ہو۔ ہم میں سے

اکثر کو اس کا تجربہ ہوا ہے۔ اب اگر مستقل یہ کیفیت ہو کہ اس وقت ہم نے اللہ کی پکار پر تو اپنے کان بند کئے اور نفس کی خواہش اور مرضی پر لبیک کہا تو ہمارا معبود کون ہوا ؟ اللہ یا ہمارا نفس؟ معلوم ہوا کہ دلوں میں صنم خانہ آباد ہے۔ اسی بات سے متنبہ کیا گیا سورۂ فرقان کی آیت ۴۳ میں: اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَهٗ ھَوٰهُ ط اَفَاَنْتَ تَکُوْنُ عَلَیْهِ وَکِیْلًا ۝ " اے نبی! آپ نے اس شخص کے حال پر غور کیا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنایا ہوا ہے۔ کیا آپ ایسے شخص کی نگرانی کر سکیں گے؟" غور کیجئے! یہاں لفظ اِلٰہ آیا ہے جو ہمارے کلمہ شہادت کے جزو اوّل میں آتا ہے: لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ "کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے" پس معلوم ہوا کہ معبود دولت بھی بنتی ہے۔ معبود نفس بھی بنتا ہے۔ دل کے اس صنم خانے کو ختم کرنا آسان کام نہیں ہے۔ پتھر کے تراشیدہ باہر کے بتوں کی نفی اور مذمت آسان ہے۔ قبر پرستی کی نفی اور مذمت بھی آسان ہے۔ اور یہ نفی و مذمت بالکل صحیح ہے۔ یہ ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔ یہ توحید کا لازمہ ہے۔ اس میں غلطی کا رائی برابر بھی کوئی شائبہ نہیں۔ لیکن دل کے اندر جو صنم خانے ہیں۔ حُبِّ مال ہے۔ حُبِّ جاہ ہے۔ حُبِّ اقتدار ہے۔ نفس کی مرضیات و خواہشات اور چاہتوں کی بجاآوری ہے —— یہ تمام چیزیں توحید کی ضد ہیں —— اس مفہوم کی ادائیگی کے لئے بھی علامہ اقبال کا بڑا پیارا شعر ہے کہ ؂

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے!
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

27621

اندر کے اس صنم خانے کو بھی دیکھنا ہوگا۔ دل کے سنگھاسن پر براجمان ان بتوں کو بھی توڑنا ہوگا جب واقعتاً یہ ہو جائے اور ساتھ ہی باہر کے بُت بھی ختم کر دیئے جائیں تو ایسے شخص کو بجا طور پر سچا موحد کہلائے جانے کا استحقاق ہوگا۔ حقیقی موحد بننے کے لئے لازم ہوگا کہ اللہ کی محبّت بھی تمام محبّتوں پر غالب آ گئی ہو۔ دوسری تمام محبّتیں اللہ کی محبت کے تابع ہو گئی ہوں۔ اللہ کی اطاعت تمام اطاعتوں سے فائق ہو گئی ہو اور دوسری تمام اطاعتیں اللہ کی اطاعت کے تحت آ گئی ہوں۔

اگر اس طور سے کوئی موحد بن گیا۔ تو یہ ہو نہیں سکتا کہ ایسے موحد کے وجود سے توحید دوسروں تک نہ پہنچے۔ یہ توحید لازماً متعدّی ہوگی۔ فرد سے دوسروں تک توحید پہنچنے کا یہ معاملہ ہے دعوت و تبلیغ —— لوگوں کو بھی توحید کی طرف بلانا اور پکارنا —— لوگوں تک بھی توحید کی دعوت کو پہنچانا ——

اجتماعی توحید اس طور پر جب انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف قدم بڑھے گا تو اس کا اگلا مرحلہ ہوگا پورے ماحول پر اللہ کی توحید کا سکّہ رواں کر دینا ــــ پورا معاشرہ موحد بن جائے۔ پوری قوم موحد بن جائے۔ پورا ملک موحد بن جائے۔ ملک کا نظام موحد بن جائے۔ ملک کا دستور توحید کا مظہر بن جائے ــــ یہ مرحلہ سر کر لیا تو اس کا نام ہے ' اقامتِ دین ــــ

حاصلِ کلام میری اس وقت تک کی گفتگو کا حاصل یہ نکلا کہ خالص انفرادی سطح پر توحید فی العبادت اور توحید فی الدعا ــ پھر اجتماعی سطح پر دعوت و تبلیغ ــــ پھر ان دونوں مراحل سے اگلا قدم اقامتِ دین ــــ یہ ہے توحید کا بل۔ ان اصطلاحات کو آپ اچھی طرح ذہن نشین کر لیں گے تو اب میری اگلی گفتگو آپ بخوبی سمجھ سکیں گے جس کے تانے بانے اور تمہید کے طور پر میں نے یہ باتیں آپ کے سامنے بیان کی ہیں۔

میں نے آپ کو اکیس سورتیں گنوائی تھیں جن کا مرکزی مضمون و موضوع توحید ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا تھا کہ ان میں چار سورتیں۔ سورۂ زمر، سورۂ مومن، سورۂ حٰمٓ السجدہ اور سورۂ شوریٰ ہیں، ان میں اس عملی توحید کا تدریجاً بیان ہے جو بطور تانا بانا اور تمہید میں آپ کے سامنے بیان کر چکا ہوں۔ بطور مثال یوں سمجھ لیجئے کہ ان چار سورتوں کی ایک ڈور ہے۔ جس میں توحید عملی کے موتی تدریجاً پروئے ہوئے ہیں اور یہ مضمون انفرادی توحید سے عملی توحید کی طرف تدریجاً بڑھتا چلا جاتا ہے ــــ

انفرادی توحید سورۂ زمر میں انفرادی توحید کا بیان ہے اور اس قدر شدّ و مد کے ساتھ اتنی تاکید کے ساتھ اور اتنے اہتمام کے ساتھ ہے کہ میرے حقیر مطالعہ کے بموجب پورے قرآن مجید میں اس اسلوب کے ساتھ یہ بیان اور کہیں نہیں ملے گا۔ البتہ اس موقع پر اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ توحید کے موضوع پر جامع ترین سورت تو سورۂ اخلاص ہی ہے جو بڑی مختصر سورت ہے۔ اس سورت کا مقام و مرتبہ یہ ہے کہ یہ توحید کا عطر ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ کوزے میں دریا بند کر دیا گیا ہے۔ اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورۂ مبارکہ کو ثلث قرآن قرار فرمایا ہے یہ اس اعتبار سے کہ تینوں بنیادی ایمانیات یعنی ایمان باللہ۔ ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرۃ میں سے ایمان باللہ یعنی توحید کا بیان اس سورت میں انتہائی جامعیت کے ساتھ وارد ہوا ہے۔

مزید یہ کہ اُس سورت کا اسلوب خبریہ و بیانیہ ہے جبکہ انشائیہ انداز اور شد و مد، انتہائی تاکید اور نہایت ہی پُر جلال اسلوب سے توحیدِ عملی کا تدریجاً بیان اِن چار سورتوں میں ہوا ہے۔ جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔

اصولی بات میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ توحید کے دو درجے ہیں۔ ایک توحید فی العلم یا توحید فی المعرفت یا توحید فی العقیدہ۔ دوسرا توحید فی العمل یا توحید فی الطلب پھر اس توحیدِ عملی کے بھی تین مرحلے ہیں۔ پہلا توحید فی العبادت اور توحید فی الدعا۔ دوسرا اسی توحید کی بندگانِ خدا کو دعوت، اسی کی تبلیغ اور تیسرا اسی توحید پر مبنی نظامِ حیات کا قیام و قرار یعنی "اقامتِ دین"۔

توحید فی العبادہ ان میں سے توحید فی العبادہ کے متعلق جان لیجیے کہ تمام انبیاء و رسل کی دعوت کا یہ نکتۂ آغاز رہا ہے۔ اس بات کے لیے قرآن مجید کی بے شمار اور متعدد آیات پیش کی جا سکتی ہیں لیکن محدود وقت کے پیشِ نظر صرف چند آیات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا ـــ سورۂ نحل میں فرمایا:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ؕ

"ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا اور اس کے ذریعے سے سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت (غیر اللہ) کی بندگی سے بچو۔"

سورۂ انبیاء میں فرمایا:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ ؕ

"(اے نبی) ہم نے آپ سے پہلے جو رسول بھیجے ان کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ لہٰذا صرف میری ہی بندگی کرو۔"

آخری پارے کی سورۂ بیّنہ میں واضح کیا گیا:

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ

"اور ان کو حکم نہیں ہوا تھا مگر اس بات کا کہ وہ اللہ کی بندگی کریں اس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے یکسو ہو کر۔"

اس آخری آیت میں رسولوں اور ان کی امتوں کے لیے یہ ضابطہ بیان ہوا کہ سب کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ سب

کے سب اللہ کی عبادت اسی کے لئے اپنی اطاعت خالص کرتے ہوئے بجالائیں۔ یہ نہ ہو کہ بظاہر بندگی اللہ کی ہو رہی ہو لیکن اطاعت اللہ کے دشمنوں کی ہو رہی ہو۔ ساز باز اللہ کے باغیوں سے ہو رہی ہو۔ ان کے احکام کی تعمیل بھی ہو رہی ہو، ان کے سامنے سر بھی جھکائے جا رہے ہوں اور دعویٰ اللہ کی عبادت کا ہو ۔۔۔ یہ طرزِ عمل ہرگز مطلوب نہیں ہے بلکہ طرزِ عمل درکار ہے مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ والا۔۔۔ پھر آخر میں حُنَفَآءَ کا اضافہ کیا گیا ہے یعنی یک سو ہو کر ۔۔۔ کئی رنگی طرزِ عمل مطلوب نہیں ہے۔ اللہ کو تو دو رنگی بھی پسند نہیں ہے۔ کئی رنگی تو بہت دور کی بات ہے۔ یہاں تو ایک رنگ چاہیے۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۔ انسان یک رنگ ہو جائے۔ یک سو ہو جائے وہ اپنے پورے وجود ظاہری و باطنی کے ساتھ فی الواقع اللہ کا بندہ بن جائے۔ اللہ ہی کی بندگی میں ہمہ تن رنگ جائے۔

اب میں چاہوں گا کہ سورۂ بیّنہ کی اسی آیت کے مضمون کو سورۂ زمر میں آپ کو دکھاؤں تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ یہ مضمون وہاں کس شد و مد اور کس تاکید کے ساتھ مختلف اسالیب سے بیان ہوا ہے۔ اور چونکہ اس میں انفرادی سطح پر توحیدِ عملی کا بیان ہے۔ للہذا آپ دیکھیں گے کہ وہاں صیغہ واحد کا آئے گا۔ خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو گا لیکن اس اسلوب میں تخاطب امت سے بھی ہے اور ان سے بھی جنہوں نے ابھی دعوت کو قبول نہیں کیا ہے، گویا تا قیام قیامت پوری نوعِ انسانی اس کی مخاطب ہے۔

توحید فی العبادہ ۔۔۔ انفرادی عملی توحید

سورۂ زمر کا آغاز ہوتا ہے:

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۔۔۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ "اس کتاب کا نزول ہے اللہ کی طرف سے جو العزیز (نہایت زبردست) ہے۔ جو الحکیم (بے حد و حساب حکمت والا) ہے"۔ إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۔ "ہم نے نازل کی ہے (اے نبیؐ) آپؐ کی طرف یہ کتاب یعنی قرآن مجید حق کے ساتھ" یہ فیصلہ کن کتاب ہے (إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ) اب اسی سے اقوام عالم کی قسمتوں کا فیصلہ ہو گا جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے جس کے راوی ہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتٰبِ أَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ (مسلم) "اللہ تعالیٰ اس کتاب کی وجہ سے ان قوموں کو عزت و سربلندی عطا فرمائے گا جو اس کا اعتصام کریں گی اور دوسروں کو جو اس کو پسِ پشت

ڈال دیں گی ذلت و نکبت سے دوچار فرمائے گا۔ یعنی قوموں کے عروج و زوال کی بنیاد یہ کتاب بنے گی ۔۔۔ اب آگے وہ مضمون آرہا ہے جس کے لئے میں نے یہ پوری تمہید باندھی: فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ○ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ - یہ اسلوب اور مضمون آپ کو قرآن مجید میں کسی اور جگہ نہیں ملے گا ۔۔۔ ان آیات کی ترجمانی یوں ہوگی کہ "(اے محمدؐ) پس بندگی کرو اللہ کی ۔ پوجو اللہ کو ۔ پرستش کرو اللہ کی ۔ اس کے لئے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے اور جان لو اللہ کے لئے تو خالص دین اطاعتِ کُلی ہے" اللہ کے لئے ملاوٹ والا دین نہیں ہے ۔ ملاوٹ والا دین منہ پہ دے مارا جائے گا ۔ اللہ کے ہاں مقبول ہوگا دینِ خالص ۔ ان آیات میں دو اہم الفاظ عبادت اور دین آگئے ۔۔۔ اب یہاں توقف کر کے پہلے مجھے عبادت کے مفہوم اور معنی کے متعلق کچھ عرض کرنا ہوگا ۔۔۔ 'دین' کے لفظ کی تشریح و توضیح آگے بیان ہوگی ۔

دینی اِصطلاح میں عبادت کا مفہوم

میں کئی مرتبہ عبادت کا مفہوم بیان کر چکا ہوں ۔ پچھلی مرتبہ جب یہاں آنا ہوا تھا تو آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے فرائضِ دینی کی جو تین سطحیں بیان کی تھیں تو ان میں پہلی سطح چار اصطلاحات کے حوالے سے بیان کی تھیں: اسلام ۔ اطاعت ۔ تقویٰ اور عبادت ۔۔۔ میں نے عرض کیا تھا کہ لفظ عبادت کے صحیح مفہوم کو مکمل کرنے کے لئے فارسی کے دو الفاظ جمع کر لیجئے تو بات پوری طرح سمجھ میں آجائے گی ۔ وہ دو الفاظ ہیں بندگی اور پرستش ۔ محض لفظِ بندگی سے قرآن مجید کی اصطلاح 'عبادت' کا مفہوم مکمل نہیں ہوگا اور محض پرستش سے بھی نہیں ہوگا ۔ دونوں کو جمع کریں گے تو عبادت کا مفہوم ادا ہو جائے گا ۔ بندگی میں اصل زور ہے اطاعت کی طرف ۔ غلامی اور محکومی بندگی کہلائے گی ۔ غلام اور محکوم تو اپنے آقا اور حاکم کا مطیع اور فرمانبردار ہوتا ہے ۔ اس کے دل کی کیفیت کچھ بھی ہو ۔ دل میں وہ چاہے اپنے آقا اور حاکم کو گالیاں دے رہا ہو ۔ چاہے وہ دل میں شدید باغیانہ جذبات رکھتا ہو ۔ لہٰذا بندگی میں دل کی کیفیت سے بحث نہیں ہوتی ۔ غلام اور محکوم کا کام ہے اپنے آقا اور حاکم کی اطاعت ۔ گویا بندگی یا اطاعت عبادت کا جزوِ اعظم ضرور ہے لیکن عبادت کی روح پرستش ہے ۔ لفظ پرستش میں اصل زور محبت پر ہے ۔ پرستار کس کو کہتے ہیں ۔ ! وطن پرست کون ہے ۔! جس کے دل میں ہر چیز کی محبت سے بالاتر محبت وطن کی ہوگی وہ وطن پرست کہلائے گا ۔ زر پرست کون ہے ۔؟ جس کے دل میں دولت کی محبت دوسری محبتوں پر غالب ہو جائے وہ ہے زر پرست ۔ اسی طرح آپ کہتے ہیں شہوت پرست ، شہرت پرست ۔ ایسے لوگوں کو اپنی اس پرستش یعنی محبت کی تسکین چاہئے

چاہے وہ صحیح طریق سے ہو چاہے غلط طور پر ہو۔ نفس پرست اسے کہا جاتا ہے جو نفس کا غلام بن جائے اور اس کی خواہش اور تقاضے کو جائز و ناجائز کی تمیز کے بغیر پورا کرنے کے لئے تگ و دو کر رہا ہو۔ پس جو چیز بھی انسان کو انتہائی عزیز ہوگی اس کا وہ پرستار کہلائے گا ___ لہٰذا جب بندگی اور پرستش اللہ ہی کے لئے جمع ہو جائیں یعنی ہمہ تن، ہمہ وقت، ہمہ جہت اللہ ہی کی اطاعت اور اللہ ہی کی محبت سے انسان سرشار ہو جائے تو عبادتِ رب کا حق ادا ہوگا ___ بندگی کے متعلق میں نے آپ کو پچھلی مرتبہ شیخ سعدیؒ کا شعر سنایا تھا ؎

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ اس آیت کی بڑی حد تک اس شعر میں ترجمانی کی گئی ہے ___ اسی طریقہ سے قرآن مجید میں سورۂ بقرہ کے بیسویں رکوع میں اللہ کی محبت والا مضمون آیا ہے۔ بہت پیارا مضمون ہے۔ اسے لوحِ دل پر کندہ کر لیجئے فرمایا: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ " جو لوگ (حقیقی) صاحبِ ایمان ہیں، ان کی سب سے زیادہ محبت اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ اقدس سے ہوتی ہے "۔ اگر یہ نہیں ہے تو حقیقی ایمان سے محرومی ہے۔ پھر تو محض ایک عقیدہ ہے۔ ایک موروثی (DOGMA) یا ایک (NATIONAL CREED) ہے۔ حالانکہ مطلوب یہ ہے کہ محبت اس درجہ کو پہنچ جائے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔ حقیقی اہلِ ایمان کے لئے محبوب ترین اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہوتی ہے۔

تو جب محبت اور اطاعت اللہ کے لئے مل جائیں تو یہ ہوگی اللہ کی کامل بندگی ___ اور یہی درحقیقت عبادت کی وہ تعریف ہے جو امام ابنِ تیمیہؒ اور حافظ ابنِ قیمؒ نے کی ہے۔ بلکہ حافظ ابنِ قیمؒ کے الفاظ اپنے استاد سے بھی زیادہ پیارے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ: اَلْعِبَادَةُ تَجْمَعُ اَصْلَيْنِ غَايَةَ الْحُبِّ مَعَ غَايَةِ الذُّلِّ وَالْخُضُوْعِ۔ " عبادت دو بنیادوں کے جمع ہونے سے بنتی ہے۔ پہلی یہ کہ اللہ کے ساتھ انتہائی درجہ کی محبت ہو۔ دوسری یہ کہ انسان انتہائی درجہ میں اس ہی کے سامنے اپنے آپ کو پست کر دے اور بچھا دے " ان دونوں کے اجتماع کا نام ہے "عبادت"۔[1]

---

[1] حال ہی میں العلامہ الشیخ عبدالرحمٰن بن حسن آل شیخؒ کی ایک تصنیف راقم کی نظر سے گزری۔ الشیخ مرحوم نے عبادت کی تعریف و توضیح ان الفاظ میں کی ہے: والعبادة اسم يجمع كمال الحبّ لله ونهايته فالحب (باقی اگلے صفحہ پر)

خالص اطاعت مطلوب ہے

فرمایا: فَاعْبُدِ اللّٰہَ۔ اب دیکھئے کہ یہ بات اپنی جگہ پر مکمل ہے۔ لیکن انسان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ بڑا جھگڑالو ہے۔ کچھ نہ کچھ منطق فطری طور پر ہر انسان کو ملی ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ سورہ کہف کی آیت نمبر ۵۴ کے آخری حصّہ میں ہے کہ: وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا ۝ "اور انسان بڑا جھگڑالو واقع ہوا ہے" پس وہ طرح طرح سے اپنے لئے بہانے بناتا اور حیلے تراشتا ہے تو قرآن حکیم یہاں ہر نوع کے بہانے اور حیلے کا سدباب فرماتا ہے۔ حضورؐ کو مخاطب کر کے اصل دعوت تو حضورؐ کی امت اجابت و دعوت کو دینی ہے۔ فَاعْبُدِ اللّٰہَ میں بات پوری آگئی تھی لیکن فرمایا: فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ ۝ "پس (اے نبی) عبادت کیجئے اللہ کی اس کے لئے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے"۔ میں نے یہاں 'دین' کا ترجمہ اطاعت کیا ہے۔ لفظ دین کی جب شرح بیان کروں گا تو آپ کے سامنے یہ بات آجائے گی کہ اس لفظ میں اطاعت کا مفہوم بھی شامل ہے۔ یہاں یہ جان لیجئے کہ تقریباً تمام ہی متقدمین و موٴخرین قرآن مجید کے مفسرین نے یہاں دین کا مفہوم اطاعت ہی بیان کیا ہے ـــــ یہاں اس بات پر زور دینا مقصود ہے کہ اللہ کے لئے اطاعت خالص ہو۔ یہ نہ ہو کہ کچھ اطاعت کسی کی اور کچھ اطاعت کسی اور کی کچھ اللہ کی اور کچھ نفس کی۔ کچھ اللہ کی اور کچھ ایسے حاکموں کی جو اللہ کے احکام سے آزاد ہو کر کوئی حکم دے رہے ہوں۔ تو ایسی اطاعت خلوص و اخلاص کے ساتھ نہیں ہے۔ یہ ملاوٹ والی اطاعت ہے۔ ملاوٹ والی کوئی شے ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں ہوتی تو غور کا مقام ہے کہ ملاوٹ والی اطاعت اس اللہ عزّوجل کے لئے کیسے قابلِ قبول ہو گی۔ جو خالق و مالک ارض و سماوات ہے، جو الغنی ہے، جو الحمید ہے جو الغفور ہے۔ اسی تاکید کے لئے فَاعْبُدِ اللّٰہَ کے فوراً بعد فرمایا: مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ "پس اللہ کے لئے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کرو" ـــــ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ضمن میں

(السلسل) الخلی عن ذلّ والذلّ الخلی عن حبّ لا یکون عبادۃ وانما العبادۃ ما یجمع کمال الامرین "عبادت ایسا اسم ہے جس میں کمالِ محبت اور اس کی انتہا اور اللہ کے سامنے کمالِ الذلّہ اور اس کی انتہا پنہاں ہے پس وہ محبت جس میں الذلّہ نہ ہو اور وہ ذلّت جس میں محبت نہ ہو عبادت کہلانے کی مستحق نہیں بلکہ عبادت وہ ہے جس میں یہ دونوں چیزیں جمع ہوں" ـــــ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ عربی میں ذلّت کے معنی پست ہو جانے اور بچھ جانے کے ہیں۔ (مرتب)

نہایت جامع اور مختصر الفاظ میں ہمیں ایک فارمولا عطا فرما دیا ہے کہ ہم اس کو روزمرہ معاملات پر منطبق (APPLY) کر سکتے ہیں۔ آں حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے: لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق۔ "مخلوق میں سے کسی کی (ایسے معاملہ میں) اطاعت نہیں ہے جس سے خالق کی نافرمانی ہوتی ہو" اللہ کا ایک حکم ہے۔ والدین اس کے خلاف کوئی حکم دیں تو اطاعت نہیں ہوگی۔ اللہ کے حکم کے خلاف کوئی حکم اساتذہ دیں، اطاعت نہیں ہوگی۔ اللہ کے حکم کے خلاف اقتدارِ وقت حکم دے اطاعت نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ فرمانِ نبوی علیٰ صاحب الصلوٰۃ والسلام ہے کہ لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق۔ ہاں اللہ کے احکام کے دائرے کے اندر اندر والدین کی بھی اطاعت ہوگی اساتذہ کی بھی اور اقتدارِ وقت کی بھی۔ تمدنی زندگی میں اطاعت کا دائرہ بہت وسیع ہے جس میں اولی الامر بھی شامل ہیں، والدین بھی، اساتذہ بھی، مرشدین بھی، بیوی کے لئے اس کا شوہر بھی۔ ان کے علاوہ بہت سے اور بھی۔ ان سب کی اطاعت مباحات میں ہوگی۔ اللہ کے حکم سے آزاد ہو کر اطاعت کی نہیں اور شرک لازم آیا نہیں۔ یہ ہے ان آیاتِ کریمہ وعظیمہ کا اصل درس، حقیقی سبق، اصل دعوت اور واقعی انتباہ۔ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ "سنتے ہو! اچھی طرح سن لو! آگاہ ہو جاؤ!" قرآن مجید میں جہاں بھی 'اَلَا' آیا ہے۔ شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے اس کا بڑا پیارا ترجمہ کیا ہے۔ یہ آج سے تقریباً دو سو سال پہلے کا انداز ہے۔ وہ ترجمہ کرتے ہیں "سنتا ہے!" مجھے تو یہ انداز بہت اچھا لگتا ہے۔ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ "سن رکھو! آگاہ ہو جاؤ۔ اللہ ہی کیلئے ہے خالص دین یعنی مخلصانہ اطاعت" اگر کسی اور کی اطاعت اللہ کی اطاعت سے آزاد ہو کر کی گئی اسی طرح اگر اللہ کی محبت سے آزاد ہو کر کسی اور کی محبت کی آلائش شامل ہو گئی تو معاملہ تلپٹ ہو گیا۔ دگرگوں ہو گیا۔ اس میں ملاوٹ آ گئی۔ ہاں اللہ کی محبت کے تابع اولاد سے محبت کرو کوئی حرج نہیں، وطن سے محبت کرو، کوئی حرج نہیں۔ اپنے گھر سے محبت کرو، کوئی حرج نہیں۔ لیکن یہ کہ اللہ کی محبت کے برابر اپنے دل کے سنگھاسن پر کسی کی محبت کو بٹھا لیا تو یہ شرک ہے۔ اور اگر کسی کی محبت اللہ کی محبت سے بڑھ گئی تو شرک سے بھی اوپر کا کوئی لفظ ایجاد کرنا پڑے گا۔ چونکہ ایسا لفظ ہماری لغت میں ہے نہیں۔ برابر کا معاملہ ہو گیا تو یہ شرک ہو جائے گا۔

یہاں ایک بات اور جان لیجئے کہ اطاعت کے ساتھ میں نے محبت کا ذکر کس بنیاد پر کیا ہے! اس کی پہلی بنیاد تو لفظ عبادت ہے۔ جس کی میں تشریح کر چکا کہ اس میں تذلل کے ساتھ غایت درجہ کی دلی محبت کا مفہوم بھی شامل ہے۔ دوسری بنیاد لفظ اطاعت

ہے جو طوع سے بنتا ہے۔ ہم اردو میں بھی طوعاً و کرہاً بولتے ہیں۔ طوع کے معنی دل کی آمادگی کے ہیں اور ظاہر بات ہے کہ دل کی آمادگی مستلزم ہے محبت کو۔

توحید فی العبادہ کی اہمیت

میں نے عرض کیا تھا کہ سورۂ زمر میں انفرادی توحید کا مضمون بڑی شد و مد اور بڑی شان سے آیا ہے۔ ابتدائی تین آیات کا میں قدرے شرح و بسط کے ساتھ بیان کر چکا۔ اب چند آیات مزید پیش کرتا ہوں۔ ان کی مختصر تشریح پر اکتفا کرونگا۔ اب میں سورہ زمر کی آیات نمبر گیارہ، بارہ، تیرہ اور چودہ آپ کو سناتا ہوں۔ اپنی توجہات کو پوری طرح میری گفتگو کی طرف مرتکز کیجئے!

فرمایا: قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴿۱۱﴾ دیکھئے کسی اہم بات کو (EMPHASIS) کرنے کے لئے" اس پر زور دینے کے لئے" اس کو خوب اچھی طرح ذہنوں میں اتارنے کے لئے مختلف اسالیب سے اس کی تکرار اور اس کا اعادہ بھی ایک مؤثر ذریعہ بنتا ہے۔ وہی بات جو سورہ کے آغاز میں آئی تھی، اب دوہرائی جا رہی ہے۔ وہاں اللہ تبارک و تعالیٰ نے حکم دیا تھا اور وہاں انشائیہ انداز تھا کہ: فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۔ یہاں نبی اکرمؐ سے فرمایا جا رہا ہے کہ قُلْ اے نبیؐ کہدیجئے: اِنِّیْٓ اُمِرْتُ "مجھے حکم ہوا ہے" اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ "کہ میں اللہ کی بندگی اور پرستش کروں اطاعت کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے"۔ وہی بات یہاں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوائی جا رہی ہے۔ کہ مجھے حکم ہے کہ میں اسی کی عبادت کروں۔ اپنی اطاعت کو اسی کے لئے خالص کرتے ہوئے۔ یہاں کس حکم کا ذکر ہے۔ اسی کا جو فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ کی صورت میں ابتدائے سورت میں آگیا تھا۔

اگلی آیت نمبر ۱۲ میں اسی مضمون کے مفہوم و مقصود کو مزید واضح فرمایا دیا: وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ "اور مجھے تو حکم ہوا ہے کہ سب سے پہلے فرماں بردار میں خود بنوں۔ اللہ کے احکام پر سب سے پہلے عمل پیرا میں خود ہوں۔ اللہ کے نواہی سے رک جانے والا سب سے پہلے میں خود بنوں۔ اللہ کے اوامر کو دل و جان سے بجالانے والا سب سے پہلے میں خود بنوں"۔

آگے چلئے اور دیکھئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے درانحالیکہ آپؐ معصوم ہیں کس طرح خشیتِ الٰہی اور اللہ کی نافرمانی پر خوفِ آخرت کا اظہار کرایا جا رہا ہے! فرمایا: قُلْ اِنِّیْٓ

اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ○ " (اے نبی! یہ بھی کہہ دیجئے کہ اگر میں اللہ کے حکم کی نافرمانی کردوں تو مجھے یوم عظیم (آخرت) کے عذاب کا خوف اور اندیشہ ہے"۔ غور کیجئے کہ کون سے احکام کی نافرمانی سے خوف کا یہاں اظہار ہو رہا ہے ــــ! یہاں دو ہی تو حکم آئے ہیں پہلا یہ کہ فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ۔ دوسرا یہ کہ اَنْ اَکُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ۔ لیکن ان دونوں احکام نے پوری زندگی کے فکر و نظر اور رویّہ و عمل کا احاطہ کر لیا ہے۔ اب اگر عملی زندگی میں اس توحیدِ عملی کی ذرا سی بھی خلاف ورزی ہو جائے تو اس پر محبوبِ رب العٰلمین صلی اللہ علیہ وسلّم سے کہلوایا جا رہا ہے: اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ○ اس میں دراصل اہل ایمان کے لئے انتہائی مؤثر انتباہ ہے۔

آگے پھر سنیے۔ فرمایا قُلِ اللّٰہَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّہٗ دِیْنِیْ ○ " اے نبی! (پھر) کہہ دیجئے کہ میں تو اللہ ہی کی بندگی اور پرستش کرتا ہوں اس کے لئے اپنے دین اور اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے "

اس آیت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے آپؐ کے اس عزم مصمم اور ثبات و استقلال کا اعلان کرا دیا گیا کہ میری لائی ہوئی دعوتِ توحید کو کوئی قبول کرے یا نہ کرے۔ میں تو ہر حال میں اللہ ہی کی مخلصانہ بندگی اور پرستش کرتا ہوں اور کروں گا اور میری اطاعت اسی کے لئے مخصوص ہے اور رہے گی۔

تاکید مزید آگے چلیے۔ اسی سورۂ مبارکہ کے ساتویں رکوع کی تین آیات نمبر ۶۴، ۶۵ اور ۶۶ سنئے۔ یہاں یہ مضمون پورے نقطۂ عروج (CLIMAX) کو پہنچ گیا ہے۔ اس سے زیادہ تاکیدی اسلوب آپ کو کہیں نہیں ملے گا ــــ فرمایا: قُلْ اَفَغَیْرَ اللّٰہِ تَاْمُرُوْٓنِّیْٓ اَعْبُدُ اَیُّھَا الْجٰھِلُوْنَ ○ " اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلّم) کہہ دیجئے کہ اے جاہلو! اے نادانو! اے حرص و ہوا کے بندو! کیا تم مجھے یہ حکم اور مشورہ دے رہے ہو کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کروں؟ " دیکھئے وہاں جو کشمکش چل رہی تھی اور وہ کشمکش توحید اور شرک کے مابین ہی تھی۔ اُس کشمکش میں نبی اکرمؐ پر دباؤ پڑ رہا ہے۔ سارے وفود جناب ابوطالب کے پاس کس لئے آتے تھے! ان کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ محمد سے کہہ دو (صلی اللہ علیہ وسلّم) کہ ہم انہیں اپنا بادشاہ بنانے کیلئے بھی تیار ہیں۔ اگر انہیں دولت درکار ہے تو اس کے انبار بھی ان کے قدموں میں لگا دیتے ہیں۔ جہاں چاہیں، جس خاندان میں چاہیں بس اشارہ کر دیں ہم آپؐ کا دہاں

نکاح کرانے کے لئے بھی آمادہ ہیں۔ لیکن آپؐ اپنی اس دعوت سے باز آجائیں ـــــ یہاں قریش کے ان بڑے بڑے سرداروں سے خطاب کیا جا رہا ہے اور خطاب بھی نہایت تیکھا اور تند و تلخ انداز میں۔ اَیُّھَا الْجٰھِلُوْنَ کے الفاظِ مبارکہ سے یہ بڑا ثقیل انداز ہے جو قرآن نے براہِ راست خطاب میں اختیار کیا ہے۔ عام طور پر خطاب کا یہ انداز نہیں ہے۔ لیکن یہ موقع ہی ایسا ہے کہ اندازِ تخاطب دو ٹوک ہو اور اس میں سختی ہو۔ ویسے لفظ جاہل کے عربی میں وہ معنی نہیں ہیں جو اردو میں ہیں۔ اردو میں جاہل اَن پڑھ کو کہتے ہیں۔ عربی میں جذباتی اور خواہشات سے مغلوب کو جاہل کہتے ہیں۔ اس کے مقابلہ کا لفظ ہے حلیم۔ حلیم اس شخص کو کہا جاتا ہے جو ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لیتا ہے، غور و فکر کرتا ہے، تحمل کرتا ہے، بردباری اختیار کرتا ہے اور عقل کی رہنمائی میں کوئی فیصلہ کرتا ہے ـــــ اور جاہل وہ ہے جو اپنے جذبات اور خواہشات کے تابع ہو کر اقدام کرتا ہے ـــــ اسی لیے میں نے ترجمہ کیا ہے "اے حرص و ہوا کے بندو!" یعنی اے خواہشات کے غلامو! ـــــ کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ توقع رکھتے ہو اور ان کو یہ حکم اور مشورہ دینے کی جسارت کرتے ہو کہ آپؐ اللہ کے سوا کسی اور کو پوجیں یا اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی اور پرستش کریں ـــــ معاذ اللہ

توحید فی العبادۃ کی تاکید کی انتہا

آگے چلئے۔ فرمایا: وَلَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْكَ وَاِلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝ "اور اے نبیؐ! یقیناً آپؐ کی طرف بھی وحی کی جا چکی ہے اور ان کی طرف بھی جو آپؐ سے پہلے گزر چکے ہیں اگر بالفرض آپؐ نے بھی شرک کیا تو جان لیجئے کہ لازماً آپؐ کے سارے اعمال حبط اور اکارت ہو جائیں گے اور آپؐ بھی لازماً خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے"۔ یہ بڑا چونکا دینے والا انداز ہے۔ اس کا ترجمہ کرتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی ہے۔ اس میں شرک پر جس غیظ و غضب کا اظہار ہے۔ وہ اس بات سے ظاہر ہے کہ انتہائی تاکید کے دو اسلوب یہاں موجود ہیں یَحْبَطُ اور تَكُوْنَ سے پہلے لام تاکید اور پھر مزید تاکید کے لئے آخر میں نونِ مشدّد لایا گیا ہے ـــــ میں نے ترجمہ میں یہ احتیاط کی ہے کہ لفظ "بالفرض" کا اضافہ کر دیا چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شرک کے ظہور کا کسی نوع کا کوئی امکان سرے سے نہیں ہے معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ لیکن بات میں زور پیدا کرنے اور قرآن مجید کی دعوتِ توحید کے مخاطبینِ اوّل اور تا قیامت قیامت آنے والی نوعِ انسانی کو شرک کی شناعت سے متنبہ کرنے کے لئے یہ

اسلوب اختیار کیا گیا کہ - اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! اگر آپؐ بھی شرک کریں، تو آپؐ کا مقام اور آپؐ کا مرتبہ، آپؐ کے محبوب رب العلمین ہونے کی حیثیت بھی آپؐ کو نقشک پکڑے نہیں بچا سکے گی اور آپؐ کے تمام اعمال لازماً حبط اور آپؐ بھی لازماً زمرۂ خاسرین میں سے ہو جائیں گے ـــــ یہ ہے توحید فی العمل کا تقاضا اور اس کی اہمیت ـــ قرآن مجید کے ایسے مقامات کے مطالعہ ہی سے شاید علامہ اقبال نے یہ شعر کہا تھا ؎

چوں می گویم مسلمانم بلرزم | کہ دانم مشکلات لا الٰہ را !

آگے چلئے۔ فرمایا: بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ "بلکہ (اے نبیؐ) آپؐ بس اللہ ہی کی بندگی کیجئے اور اللہ کے شکر گذار بندوں میں سے بن جائیے" ـــ پھر عبادت کی تاکید، اللہ کی بندگی اور پرستش کا موکد حکم بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ ـــــ یہ بات اچھی طرح جان لیجئے کہ یہاں عبادت سے مراد محض ارکان اسلام یعنی شہادتین، صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم اور حج نہیں ہیں بلکہ پوری زندگی اللہ کی بندگی میں بسر کرنا مراد ہے۔ اسی رویّہ کی ایک تعبیر شکر ہے۔

خلاصۂ کلام | میں نے سورۂ زمر کے تین مقامات سے تین، پھر چار اور پھر تین آیات یعنی کل دس آیات کی قدرے تفصیل آپ کے سامنے بیان کی ہے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ انفرادی سطح پر عملی توحید کیا ہے! وہ ہے اللہ کا بندہ بن جانا ہمہ تن، ہمہ وقت، ہمہ جہت ـــ اطاعت اسی کے لئے خالص ہو۔ دوسروں کی اطاعت کی جائے تو اس کی اطاعت کے تابع ہو کر کی جائے اس سے آزاد ہو کر نہ کی جائے۔ بنیادی اور حقیقی شدید ترین محبت اللہ تبارک وتعالیٰ سے ہو۔ دوسروں سے محبت اس سے نیچے نیچے اور ورے ورے اور اس تعالیٰ کی محبت کے تابع ہو۔ گویا سب سے اونچی محبت اللہ ہی کی ہو ـــ انفرادی توحید کی یہ شرط لازم ہے کہ عبادت، اطاعت اور محبت اسی کے لئے خالص کر لی جائے ـــ اگر اس میں کہیں ملاوٹ آگئی تو وہ توحید نہیں ہے۔ یہ ملاوٹ اور یہ کھوٹ شرک کے درجے میں آئے گی۔ اور ہمارے اگلے پچھلے تمام اعمال کے حبط اور اکارت ہونے کا ذریعہ بن جائے گی۔

توحید فی الدّعاء

میں نے عرض کیا تھا کہ انفرادی سطح پر توحید فی العبادہ کے ساتھ ہی توحید فی الدعا کا معاملہ ہے۔ یہ دونوں امور باہم گتھے ہوئے ہیں۔ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ احادیث بھی آپ کو سنائی تھیں کہ:

الدعاء مخ العبادۃ اور الدعاء ھو العبادۃ ـــــ توحید فی العبادہ کے ضمن میں سورۂ زمر کے تین مقامات اور ان کی امکانی حد تک تشریح و توضیح میں آپ کے سامنے بیان کر چکا ہوں۔ اس سے آگے اب اگلی سورت، سورۂ مومن میں توحید فی الدعاء کا بڑے شد و مد کے ساتھ ذکر ہے۔ ـــــ دعا درحقیقت انفرادی سطح کی عبادت کا ہی ایک باطنی پہلو ہے۔ جو آپ کا معبود ہے، جس کے بارے میں آپ کا ایمان اور یقین ہے کہ وہی ہے حاجت روا، وہی ہے مشکل کشا۔ جس کے متعلق آپ کو یقین ہے کہ وہی عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے، وہی اَلسَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ہے، وہ ہر آن آپ کے ساتھ ہے 'ھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ' ـــــ ظاہر بات ہے کہ ایسی ہستی کو آپ پکاریں گے۔ اس سے استعانت و استمداد کریں گے ـــــ اس سے دعائیں کریں گے۔ اس سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لئے عرض و معروض کریں گے۔ پس دعا عبادت کا ایک باطنی رُخ ہے۔ اس دعا کی اہمیت کے لئے میں سورۂ مومن کی تین آیات آپ کو سناتا ہوں۔ میرے حقیر مطالعہ کے مطابق قرآن میں چار مقامات ہیں جہاں دعا کے ساتھ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ کے الفاظ آئے ہیں۔ ایک سورۂ عنکبوت آیت نمبر ۶۵ میں: فَاِذَا رَکِبُوْا فِی الْفُلْکِ دَعَوُا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ۵ "جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے اس سے دعا مانگتے ہیں" ـــــ دوسرے سورۂ لقمٰن کی آیت نمبر ۳۲ میں: وَاِذَا غَشِیَھُمْ مَّوْجٌ کَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ ۵ "اور جب (سمندر میں) ایک موج ان لوگوں پر سائبان کی طرح چھا جاتی ہے تو یہ اللہ ہی کو پکارتے ہیں اپنے دین کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے"۔ ان دو آیتوں میں سمندری سفر میں مشرکین کی اللہ سے مخلصانہ دعاء کا تذکرہ ہے۔ اس موقع پر نہ انہیں لات یاد آتا ہے نہ منات نہ ہبل۔ کسی دیوی اور دیوتا کے بجائے وہ خالص اللہ ہی کو مدد و دستگیری کے لئے پکارتے ہیں [۱]۔ لیکن میرے خیال میں سورۂ مومن کی آیت نمبر ۱۴ اور نمبر ۶۵ جس کا بیان آگے آئے گا، وہ مقام ہے جہاں انشائیہ انداز اور امر کے صیغہ میں دعا کے ساتھ مُخْلِصِیْنَ لَہُ

۱ے اس ضمن میں حضرت عکرمہ ابن ابوجہل رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے واقعہ کا ذکر مناسبِ حال ہوگا۔ ان کی روایت کا مفہوم یہ ہے کہ "جب مجھے علم ہوا کہ میرا نام ان مجرموں میں شامل ہے، جن کے قتل کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر حکم جاری فرما چکے تھے تو میں نے قتل کے خوف سے حبشہ منتقل ہونے کیلئے مکہ چھوڑ دیا۔ جب ساحل سے حبشہ جانے کے لئے کشتی میں سوار ہوا تو اثنائے راہ میں زبردست طوفان آگیا ـــــ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

الدِّیۡنَ کے الفاظ آئے ہیں ــــ اللہ کو پکارو لیکن کس طرح ـ؟ اس کے لئے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے ـ یہ نہیں کہ کچھ اطاعت اللہ کی بھی ہو رہی ہے اور کچھ دوسروں کی بھی۔ لیکن پکار رہے ہیں اللہ کو ـ ایسی دعا قبول ہونے والی نہیں ہے ـ میں اس کی آگے وضاحت کروں گا ـ پہلے میں وہ آیت آپ کو سنا دوں ــ بڑی پیاری آیت ہے ـ فرمایا: فَادۡعُوا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ۝ "پس اللہ ہی کو پکارو" ـ لیکن کس شان سے! کس کیفیت میں!! "اپنی اطاعت کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار گزرے ـ" ظاہر بات ہے کہ اگر پورا نظام شرک پہ قائم ہو اور اس میں آپ توحید کا نظام برپا کرنا چاہیں گے تو کافروں اور مشرکوں کو سخت ناگوار ہو گا ـ وہ سب روڑے اٹکائیں گے ـ اور وہ کسی نہ کسی بہانے آپ سے تصادم مول لینے کی کوشش کریں گے ـ

یہاں دعا کے لئے بھی مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ کی شرط عائد کر دی گئی ہے ـ جیسے عبادت میں عائد کی گئی تھی ـ خلوص و اخلاص صرف اللہ ہی کے لئے نہ ہو تو اس سے دعا کرنا اسے پکارنا بے معنی ہے ـ اس سلسلے میں ایک حدیث آپ کو سناتا ہوں جس سے دعا کی قبولیت کی شرائط واضح طور پر سامنے آتی ہیں ــ پہلے تو حدیث سن لیجئے جس کے راوی ہیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور امام مسلمؒ نے اس کو اپنی صحیح میں بیان کیا ہے ـ میں پہلے آپ کو حدیث کا وہ حصہ سناتا ہوں جو دعا کی شرائط سے متعلق ہے ـ اس کے بعد ترجمہ اور اس کی توضیح ساتھ ساتھ کروں گا: حدیث کا دعا سے متعلقہ حصہ یہ ہے کہ

(مسلسل) مسافروں نے پہلے تو اپنے دیوی اور دیوتاؤں کو پکارا لیکن طوفان شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا تو ان کی زبان سے نکلا کہ اب تو صرف "اللہ" ہی ہمیں بچا سکتا ہے ـ چنانچہ سب ہی نہایت الحاح و زاری کے ساتھ اللہ سے اس مصیبت سے نجات کی دعائیں کرنے لگے ــ دعا قبول ہوئی اور طوفان تھم گیا ـ البتہ طوفان نے کشتی کو جدہ کی بندرگاہ ہی پہ واپس دھکیل دیا" ـ اس کے بعد حضرت عکرمہؓ اپنے دل کی کیفیت بیان کرتے ہیں کہ: "اس موقع پر اچانک میرے دل میں روشنی پھوٹی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت اسی توحید ہی کی تو ہے اور یہ بت انسان کے کام آنے والے نہیں یہ تو ہمارے ہاتھوں کے تراشیدہ بے چارے اور معذور ہیں" ــ آگے وہ کہتے ہیں کہ "میں نے دل میں اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر میں طوفان سے بچ گیا تو آں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لوں گا ـ" جب جدہ پر کشتی واپس آئی تو وہاں انہوں نے اپنی اہلیہ کو موجود پایا جو خود بھی مشرف باسلام ہو چکی تھیں اور حضرت عکرمہؓ کے لئے نبی اکرمؐ کی جانب سے معافی کی نوید لائی تھیں ـ حضرت عکرمہؓ کو بڑا اطمینان ہوا کہ وہ معافی کی خوشخبری سننے سے قبل ہی اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے ـ (مرتب)

ثم ذکر الرجل یطیل السفر اشعث اغبر یمد یدیہ الی السماء یارب یارب و مطعمہ حرام و مشربہ حرام و ملبسہ حرام و غذی بالحرام فانی یستجاب لذلک۔

"پھر ایک شخص کا آں حضورؐ نے ذکر فرمایا کہ وہ بہت دور دراز کا سفر کرتا ہے۔ بال اور کپڑے غبار آلود ہیں۔ بڑی بوسیدگی، بے چارگی اور درماندگی اس پر طاری ہے۔ وہ شخص اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا رہا ہے"۔۔۔ دیکھئے حالتِ سفر میں دعا کی مقبولیت کی آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے خبر دی گئی ہے۔ چونکہ مسکنت ہوتی ہے۔ انسان بے یار و مددگار ہوتا ہے۔ اجنبیوں میں ہوتا ہے تو واقعہ یہ ہے کہ سفر کی حالت میں دعا دل سے نکلتی ہے اور جو دعا دل سے نکلے وہ اثر رکھتی ہے اور قبول ہوتی ہے اور عام طور پر گمان یہی ہے کہ یہاں نبی اکرمؐ ذکر فرما رہے ہیں کسی شخص کے سفر حج کا۔ حج کے لئے دور دراز سے اور مختلف مقامات سے لوگ آتے ہیں تھکے ماندے۔ پھر واقعہ یہ ہے کہ مناسک حج بڑے کٹھن اور مشقت طلب ہوتے ہیں۔ منیٰ کا سفر ہے پھر وقوفِ عرفہ ہے۔ مزدلفہ میں پڑاؤ ہے پھر منیٰ واپسی ہے۔ رمی جمار ہے، نحر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دسویں تاریخ کا دن بڑا سخت اور مشقت سے پُر ہوتا ہے ہر شخص تکان سے اس روز چور چور ہوتا ہے۔۔۔ ان دشوار اور دقت طلب مواقع کا تصور کیجئے اور دیکھئے کہ ان حالات میں ایک شخص یَمُدُّ یَدَیْہِ اِلَی السَّمَآءِ۔ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف دعا کے لئے اٹھاتا ہے اور کہتا ہے یارب، یارب۔۔۔ جبل رحمت کا مقام سمجھ لیجئے۔ یا وقوف عرفہ کا نقشہ کھینچ لیجئے۔ یا مقام ابراہیم کو خیال کر لیجئے۔ یا ملتزم کا منظر تصور کی نگاہوں میں لے آئیے۔ جہاں اس سے چمٹے ہوئے لوگ گڑگڑا کر دعائیں کرتے ہیں۔۔۔ لیکن فانی یستجاب لذلک۔ ایسے شخص کی دعا قبول ہو تو کیسے ہو! و مطعمہ حرام و ملبسہ حرام و غذی بالحرام۔ جبکہ اس کا کھایا ہوا بھی حرام کا ہے، اس کا پہنا ہوا بھی حرام کا ہے اور جس غذا سے اس کا جسم بنا ہے وہ بھی حرام کی ہے ۔۔۔ معلوم ہوا کہ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ والا معاملہ تو ہے نہیں۔ کمائی میں تو اللہ کا حکم مانتا نہیں۔ معاش میں تو حرام میں منہ مار رہا ہے اور یہاں آ رہا ہے دعائیں کرنے کے لئے۔ کیا منہ ہے اس کا کہ وہ اللہ سے کلام کرے۔!! یہی بات ہے جو سورۂ بقرہ میں ارشاد فرمائی گئی ہے کہ ہم تو تمہاری دعائیں سننے اور قبول کرنے کے لئے تیار ہیں، لیکن ہمارے بندو! یہ بھی تو دیکھو کہ تم ہمارے احکام کے ساتھ کیا معاملہ کر رہے ہو۔!! فرمایا: وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ

قَرِیۡبٌ ؕ اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ وَلۡیُؤۡمِنُوۡا بِیۡ لَعَلَّھُمۡ یَرۡشُدُوۡنَ ۱۸۶؁ (اے نبی۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)) جب میرے بندے آپؐ سے میرے بارے میں پوچھیں تو ان کو بتادیجئے کہ میں قریب ہی ہوں[لے] ۔ میں تو ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں اور قبول کرتا ہوں، وہ جہاں اور جب مجھے پکارے۔ لیکن فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ وَلۡیُؤۡمِنُوۡا بِیۡ۔ انہیں بھی چاہیئے کہ میری باتوں کو قبول کریں۔ میرا کہا مانیں۔ میرے احکام پر عمل کریں۔ میری پکار پر لبیک کہیں۔ مجھ پر ایمان رکھیں، لَعَلَّھُمۡ یَرۡشُدُوۡنَ۔ تاکہ وہ راہ راست پالیں اور کامیابی سے ہم کنار ہو جائیں"۔ معلوم ہوا کہ یہ یک طرفہ معاملہ (ONE WAY TRAFFIC) نہیں ہے یہ دو طرفہ معاملہ ہے۔ تم اللہ کا کہنا مانو گے، اس کے احکام پر چلو گے، اس کے مطیع بن کر رہو گے، اس پر ایمان رکھو گے تو اللہ تمہاری دعائیں قبول کرے گا۔ تم اللہ سے محبت کرو گے اللہ تم سے محبت کرے گا یُحِبُّھُمۡ وَیُحِبُّوۡنَہٗۤ۔ یہ شان ہوگی اہل ایمان کی ــــ تم اللہ کو یاد کرو، اللہ تمہیں یاد کرے گا ــــ فَاذۡکُرُوۡنِیۡۤ اَذۡکُرۡکُمۡ ــــ حدیث میں اس کی وضاحت آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا بندہ اگر مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں اور اگر میرا بندہ کسی محفل میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس سے کہیں اعلیٰ محفل میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ وہ محفل ملائکہ مقربین ہی کی ہوسکتی ہے ــــ اس محفل میں اللہ تعالیٰ اس بندے کا ذکر فرماتا ہے جو اس دنیا میں کسی محفل میں اس کا ذکر کرتا ہے ــــ اسی طریقے سے آگے حدیث میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر بندہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ بندہ اگر بالشت بھر میرے قریب ہوتا ہے تو میں ہاتھ بھر اس کے قریب ہو جاتا ہوں" ــــ قرآن کا ایک مقام مجھے اور یاد آیا۔ فرمایا: اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ یَنۡصُرۡکُمۡ۔ "تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا"۔ اللہ کی مدد بندے کی جانب سے کیا ہے؟ اس کے دین کے غلبہ اور اقامت کے لئے مال اور جان کھپا دینا۔ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ وَتُجَاھِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِاَمۡوَالِکُمۡ وَاَنۡفُسِکُمۡ ؕ معلوم ہوا کہ اللہ کے ساتھ معاملہ یک طرفہ کی بجائے دو طرفہ ہوگا۔

تو یہاں سورۃ مومن میں فرمایا: فَادۡعُوا اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ۔

اخلاص فی الدعا

پس پکارو اللہ کو دین یعنی اطاعت کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے،

لے اللہ تعالیٰ کی قربت اور معیت کی تفہیم کے لئے سورۃ قٓ کا یہ مقام: وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡہِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ اور سورۂ حدید کا یہ مقام: وَھُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ۔ پیش نظر ہیں۔ (مرتب)

وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ چاہے یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

اسی سورۂ مومن میں آیت نمبر ۶۰ بھی اس موضوع پر بہت اہم ہے۔ فرمایا:
وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۝ دعا کے موضوع پر جیسا کہ میں نے عرض کیا نہایت اہم آیات میں سے ہے۔ ترجمہ ہے "اور تمہارے رب نے یہ فرمایا ہے کہ پکارو مجھے۔ میں تمہاری پکار سنوں گا، تمہاری دعائیں قبول کروں گا حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بر بنائے تکبر اور گھمنڈ میں آکر میری عبادت، سے اباء کرتے ہیں، اعراض کرتے ہیں، منہ موڑتے ہیں وہ جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل وخوار ہو کر" اس آیت سے استدلال کیا جائے گا کہ عبادت اور دعا ایک ہی ہیں۔ ممکن ہے کہ اسی آیت کی تشریح وتفسیر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو کہ الدعاء هو العبادة اور الدعاء مخ العبادة ۔ دیکھئے اور خوب غور کیجئے کہ اس آیت کریمہ کے پہلے حصہ میں دعا کا اور دوسرے حصہ میں عبادت کا ذکر آیا تو آپ خود بھی کسی تامل کے بغیر اس نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں کہ دعا اور عبادت ایک ہی عمل کے دو رُخ ہیں۔ اس میں کسی اشتباہ کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔

آگے چلئے اس سورۂ مبارکہ کی آیت نمبر ۶۵ ہے جس میں یہ بات پھر آئی۔ فرمایا: هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ "وہ اللہ الحی ہے، ہمیشہ ہمیش زندہ رہنے والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس اسی کو پکارو دین کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے۔ کُل شکر وسپاس اور تعریف وثنا اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا مالک اور پروردگار ہے"۔ دیکھئے یہاں اس آیت میں توحید کے ذکر سے آغاز ہوا اور توحید کے بیان پر ہی اس آیت کا اختتام ہوا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ شہادتین کا پہلا جزو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کلمۂ توحید ہے۔ اسی طرح جان لیجئے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ بھی کلمہ توحید ہی ہے جو نہ صرف سورۂ فاتحہ کی (جس کو اُمّ القرآن اور اساس القرآن کے نام بھی دیئے گئے ہیں)، پہلی آیت ہے بلکہ قرآن مجید کی بھی پہلی آیت ہے۔

آگے بڑھنے سے قبل میں چاہوں گا کہ آپ اسی سورۂ مبارکہ کی آیت نمبر ۶۶ اور اس کا ترجمہ بھی سن لیں۔ اس میں بھی آپ دیکھیں گے کہ عبادت کے بدل کے طور پر دعا ہی کا ذکر آیا ہے۔ فرمایا:
قُلْ اِنِّىْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَاۗءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ ۡ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ "اے نبیؐ! ان لوگوں سے کہہ دیجئے

کہ مجھے تو ان ہستیوں کی عبادت سے منع کر دیا گیا ہے جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو۔ (میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں) جب کہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے بیّنات (کھلی کھلی نشانیاں) آچکی ہیں۔ مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ میں رب العلمین کے آگے سرِ تسلیم خم کر دوں اور اس کا فرمانبردار و مطیع بندہ بن کر رہوں۔"[1]

آپ نے دیکھا کہ سورۂ زمر میں عبادت کا کس قدر تاکید اور شدومد کے ساتھ بیان ہے۔ اطاعت کو اللہ ہی کے لئے خالص کرتے ہوئے۔ اور اگلی سورت سورۂ مومن میں دعا کا ذکر آگیا لیکن دعا بھی اللہ ہی کے لئے اپنے دین کو خالص کرتے ہوئے۔ اس طرح انفرادی سطح کے خارجی اور باطنی دونوں پہلوؤں کا احاطہ ہو گیا۔ اب اگلی بات کی طرف آئیے

دعوت الی اللہ: دعوتِ توحید

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ انفرادی توحید جب فرد سے آگے بڑھے گی تو یہ کام "توحید کی دعوت" کی شکل اختیار کرے گا۔ یعنی لوگوں کو اللہ کی توحید کی طرف بلانا اور پکارنا۔ چنانچہ اسی سورۂ مومن ہی اس ضمن میں مومنِ آلِ فرعون کا ایک قول نقل ہوا ہے۔ ہوا یہ تھا کہ آل فرعون میں سے ایک با اثر بڑی شخصیت

---

[1] محترم ڈاکٹر صاحب کے اس خطاب میں "توحید فی العبادت کی اہمیت اور اس کا ہمارے دین میں مقام" کے موضوع پر اصولی باتیں آگئی ہیں۔ تاہم اس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر راقم دو آیات مزید پیش کرنا چاہتا ہے جن میں نہی کے اسلوب میں اللہ کے سوا یا اللہ کے ساتھ کسی اور سے دعا کی ممانعت کی گئی ہے۔ مخاطب نبی اکرمؐ ہیں لیکن آپؐ کی وساطت سے پوری نوعِ انسانی بالعموم اور مدعیانِ ایمان بالخصوص مخاطب ہیں۔ پہلی آیت سورۂ یونس کی ہے۔ فرمایا: وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ "اور اے نبیؐ! اللہ کو چھوڑ کر کسی ہستی کو نہ پکارو (اللہ کے سوا) کوئی چیز نہ آپ کو فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ نقصان۔ اگر (بالفرض) آپؐ نے ایسا کیا تو آپؐ بھی ظالموں (یعنی مشرکوں) میں سے ہو جائیں گے ـــــ دوسری آیت سورۂ شعراء کی ہے، فرمایا: فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ ۝ "پس (اے نبیؐ) اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو۔ اور اگر (بالفرض) آپؐ نے ایسا کیا تو آپؐ بھی سزا پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔" نہی کے اسلوب میں جو تاکید ہوتی ہے اور جو زور ہوتا ہے نیز مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اور مَعَ اللّٰهِ میں جو تمیز و امتیاز اور فرق و تفاوت ہے وہ ادنیٰ تامل سمجھ میں آسکتا ہے۔ (مرتب)

حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آئی تھی۔ جو بڑے پائے کے درباری بھی تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے ایمان کو چھپائے رکھا تھا۔ یَکْتُمُ اِیْمَانَہٗٓ ۔ میں شاید پہلے بھی اس کا تذکرہ کر چکا ہوں کہ مومنِ آلِ فرعون نے اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھا ہوا تھا تا آنکہ جب وہ مرحلہ آیا کہ فرعون نے کہا کہ اب میں موسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کر کے رہوں گا۔ اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے درباریوں میں بھی حضرت موسیٰ کے کچھ حامی (SUPPORTERS) موجود ہیں۔ اگر اسے یہ اندازہ نہ ہوتا تو اسے دربار میں حضرت موسیٰؑ کو قتل کرنے کی بات رکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے دربار میں تجویز پیش کرتا ہے کہ: وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰیؔ[1] "اور فرعون نے (ایک روز اپنے درباریوں سے) کہا" مجھے چھوڑ دو۔ اجازت دو، میں موسیٰ (علیہ السلام) کو قتل کئے دیتا ہوں" حالانکہ خدائی کا دعویدار ہے۔ لیکن میں عرض کیا کرتا ہوں دنیا میں بادشاہوں کا یہ حال ہوتا ہے۔ بادشاہ کیا ہے! دو ہاتھ اور دو پاؤں اس کے بھی ہیں۔ اگر اس کے منصب دار اس کا ساتھ نہ دیں، اس کے پنج ہزاری، بیس ہزاری، تیس ہزاری، اس کی پشت پر نہ ہوں اس کی فوج کے بڑے بڑے جرنیل اور سپہ سالار اور دوسرے بااثر لوگ اس کے ساتھ نہ ہوں تو اکیلے بادشاہ سلامت کیا کریں گے! یہی وجہ تھی کہ جب فرعون کو اندازہ ہو گیا کہ حضرت موسیٰؑ کی دعوت کا اثر میرے چند درباریوں پر بھی ہو چکا ہے تو اس نے قدم اٹھانے سے پہلے ضروری سمجھا کہ اپنے درباریوں سے استصواب کر لے۔ ان کی رائے اور تائید حاصل کرے۔ اسی لئے اس نے دربار میں کہا: ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی ۔ "اب مجھے اجازت دو کہ میں موسیٰ کو قتل کر دوں"۔

مومن آلِ فرعون کی تقریر

اس موقع پر وہ مومنِ آلِ فرعون کھڑے ہو گئے ـــــ اس سورت کا نام ہی "سورۃ المومن" ہے اس لئے کہ ان مومنِ آلِ فرعون کی تقریر اس سورت میں بڑی تفصیل سے آئی ہے ـــــ یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ پورے قرآن مجید میں کسی نبی یا رسول کی اتنی طویل تقریر نقل نہیں ہوئی ہے جتنی ان مومنِ آلِ فرعون کی ـــــ اس سورت بالخصوص ان مومنِ آلِ فرعون کی تقریر کا مطالعہ ضرور کیجئے گا ـــــ وہ مومنِ آلِ فرعون اس موقع پر کھڑے ہو گئے۔ اس لئے کہ یہ بڑا نازک مرحلہ (CRITICAL MOMENT) تھا کہ حضرت موسیٰؑ کے قتل کا فرعون کی تحریک و تجویز پر فیصلہ ہونے والا تھا ـــــ اس وقت آلِ فرعون کے وہ مردِ مومن کھڑے ہوئے اور انہوں نے نہایت مؤثر تقریر کی جو قرآن مجید

---

[1] سورۂ مومن آیت ۲۶ کا ابتدائی حصہ۔

میں نقل ہوئی ہے جس کے نتیجہ میں فرعون کو جو خدائی کا دعوے دار اور مدعی تھا اپنا (RESOLUTION) واپس لینا پڑا ۔ ان کی تقریر کا پورے دربار پر اتنا اثر ہوا کہ پھر فرعون کو جرأت نہیں ہوئی کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہاتھ اٹھائے ۔ اب آیئے مومنِ آلِ فرعون کے اس قول کی جانب جس کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا

مومنِ آلِ فرعون کی دعوتِ توحید

اس تقریر میں وہ مومنِ آلِ فرعون کہتے ہیں: وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ؀[1] ' اے میری قوم کے لوگو! کیا معاملہ ہے غور کرو ۔ میں تمہیں نجات کی دعوت دے رہا ہوں، میں تمہیں اس راستہ کی طرف پکار رہا ہوں جو فوز و فلاح اور رشد و کامرانی کی طرف لے جانے والا ہے ۔ اور تم مجھے آگ کی طرف بُلا رہے ہو ۔ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۡ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ؀[2] تم تو مجھے دعوت دے رہے ہو کہ میں اللہ کا انکار کردوں اور اس کے ساتھ شرک کروں جس کے لئے کوئی علم اور کوئی سند یا دلیل میرے پاس نہیں ہے اور میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں، بُلا رہا ہوں، پکار رہا ہوں اس ہستی کی طرف جو العزیز ہے الغفار ہے ۔ ہر نوع اور ہر قسم کے اختیارات اسی کے ہاتھ میں ہیں اور وہ بہت اور نہایت معاف فرمانے والا ہے ۔

دعوتوں کا فرق

مومنِ آلِ فرعون کے ان اقوال میں یہ بات بھی واضح طور پر آگئی کہ دنیا میں دعوتیں دونوں بیک وقت موجود رہتی اور چلتی ہیں ۔ توحید اور ایمان کی دعوت بھی ہے اور کفر و شرک کی دعوت بھی ۔ ——— قیامت تک یہ دعوتیں چلیں گی ۔ جیسے علامہ اقبال نے اس شعر میں کہا ہے ؎

ستیزہ کار رہا ہے اَزل سے تا اِمروز　　　چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی !!

داعیانِ حق بھی رہیں گے اور داعیانِ باطل بھی رہیں گے اور ان میں سے بھی رہیں گے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے اور کہلواتے ہیں ۔ کیا جلال الدین اکبر اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہتا تھا ۔ ؟ کیا اس دور میں بھی کچھ ایسے لوگ موجود نہیں ہیں جو مسلمانوں جیسے نام رکھ کر اور خود کو مسلمان کہلا کر الحاد، زندقہ، بے حجابی، بے پردگی، اباحیت اور نہ معلوم کس کس ضلالت کی طرف دعوت دینے میں نہایت منظم طریق اور بہترین تکنیک سے معروف ہیں ! ایسے لوگ موجود ہیں اور یقیناً موجود

---

[1] آیت نمبر ۴۱　[2] آیت نمبر ۴۲

ہیں۔ ان کی بڑی اکثریت ذرائع ابلاغ ـــــ اور بڑے بڑے کلیدی مناصب پر فائز ہے اور وہ ہمارے معاشرے میں اسلامی فکر اور اسلامی اقدار میں سرنگیں لگا رہے ہیں۔ اسلام کی جڑیں کھود رہے ہیں۔ ہمارے اسی معاشرے میں حدود اللہ کا تمسخر و استہزاء اور اس سے بغاوت کرنے والے موجود ہیں اور اسی کی دعوت دینے اور ترویج میں لگے ہوئے ہیں، اسی کام میں اپنی بہترین صلاحیتیں اور توانائیاں لگا رہے ہیں ـــ لہٰذا دعوتیں ہمیشہ رہیں ـــ ایک ہے توحید کی دعوت اور ایک ہے کفر کی دعوت۔ ایک دعوت ہے ایمان و اسلام کی، ایک ہے شرک اور الحاد کی ـــ اور ہمارے معاشرے میں بھی بالفعل و بالقوۃ یہ مختلف دعوتیں موجود ہیں بلکہ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ باطل کی دعوت بہت منظم اور ہمہ گیر ہے۔ اس کے داعیان بڑے کیاد، عیّار اور چالاک ہیں۔ پھر ذرائع ابلاغ پر ان کی گرفت (HOLD) بہت مضبوط ہے جس کے ذریعے وہ معاشرے کو (SLOW POISON) دے رہے ہیں۔ وہ ہماری ان کمزوریوں سے خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں جو ایک طرف شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ کے ذیل میں آتی ہیں، دوسری طرف ان کا سبب ڈیڑھ دو صدیوں تک انگریزوں کا سیاسی استیلاء ہے جس کے باعث سیاسی غلبہ ختم ہو جانے کے باوجود بھی ہماری ذہنی مرعوبیت اور غلامی میں کمی ہونے کے بجائے روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ دراصل ہمارا نصاب اور نظام تعلیم ان ہی فکری اساسات پر مبنی ہے جو ملحدانہ اور مادہ پرستانہ ذہنیت وجود میں لاتی ہیں۔ اس کی نشوونما کرتی ہیں اور مسلمان نما ملحدوں کی معاشرے میں کثرت کا باعث بنتی ہیں۔

ایک موحد کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے؟

آگے چلیئے اور اگلی سورت، سورۂ حٰمٓ السجدہ کی آیت نمبر ۳۳ سنئے۔ بڑی پیاری اور مہتم بالشان آیت ہے فرمایا: وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ "اس شخص سے بہتر بات اور کس کی ہوگی"۔ ـــ یوں تو سب کے پاس زبانیں ہیں اور آج کل قلم ہیں اور چھاپنے کے لئے اخبارات و رسائل ہیں۔ اخبارات اور رسائل اب انڈسٹری بن چکی ہے۔ صحافت نہیں رہی۔ صحافت کا نام تو خواہ مخواہ بدنام ہو رہا ہے۔ یہ ایک کاروبار ہے۔ جس طرح ایک کاروبار اور انڈسٹری کا کام یہ ہے کہ معاشرے میں جس چیز کی طلب ہو اسے ہی وہ مہیا اور پیدا کریں گے یا پھر کسی ایسی چیز کی معاشرے میں مانگ (DEMAND) پیدا کریں گے جس میں ان کو غیر معمولی منفعت کا یقین ہو، چاہے وہ شے نفسانی خواہشات کو مہمیز کرنے والی

کیوں نہ ہو پھر اس کو سپلائی کرنے کے لئے مسابقت کریں گے ـــــ جس کے متعلق حال ہی میں صدرِ مملکت صاحب نے فرمایا ہے کہ اخبارات میں سرخی پاؤڈر کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے اس لئے کہ مدیر حضرات میں طلب اسی کی ہے۔ انہیں تو اپنا پرچہ بیچنا ہے۔ پیسہ کمانا ہے۔ اس کے سوا ان کے سامنے کوئی اصول نہیں، کوئی اعلیٰ قدر نہیں، کسی ذمہ داری کا احساس نہیں۔ جو کسی نے لکھ کر بھیجدیا شائع کر دیا۔ پرچے کا پیٹ بھرنا ہے۔ قارئین کی تفریح اور دلچسپی کا سامان مہیا کرنا ہے۔ کچھ نہیں سوچنا کہ لکھنے والا کفر لکھ رہا ہے، شرک لکھ رہا ہے، فحش لکھ رہا ہے۔ اللہ کے دین کا مذاق اڑا رہا ہے۔ شعائرِ دینی کا تمسخر اور اقدارِ دینی کا استہزاء کر رہا ہے۔ قرآنی آیات کے تراجم و مطالب میں تحریف کر رہا ہے اور احادیث کو بازیچۂ اطفال بنا رہا ہے۔ پھر اخبارات و رسائل میں کثرت کے ساتھ لوگوں کی نگاہوں کو دعوتِ زنا دینے والی تصاویر شائع کی جا رہی ہیں۔ انہیں زیادہ سے زیادہ دیدہ زیب اور دلکش بنایا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ دھڑلے سے ہو رہا ہے، اس ملک میں ہو رہا ہے جس کے قیام کا مقصد لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ بتایا گیا تھا اور جس کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے ـــــ اور جس میں کوئی دن نہیں جاتا کہ یہ نوید نہ سنائی جاتی ہو کہ اس ملک میں جلد ہی اسلامی نظام آ رہا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ اس دور میں بھی دعوتیں بہت سی ہیں، زبان بھی ہے قلم بھی ہے جو جس کے جی میں آ رہا ہے کہہ رہا ہے اور لکھ رہا ہے۔ لیکن فرمایا: وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ اس شخص سے بہتر بات کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف دعوت دے رہا ہو، اللہ کی طرف پکار رہا ہو لوگوں کو بلا رہا ہو اور اس کے ساتھ اس کا عمل بھی دعوت کی مناسبت سے صالح ترین ہو ـــ بالکل درست ہو۔ خلوص و اخلاص پر مبنی ہو۔ خود اس پر کاربند ہو۔ یہ نہ ہو کہ اوروں کو نصیحت اور خود میاں فضیحت والا معاملہ ہو رہا ہو۔ بلکہ نقشہ یہ ہو کہ جو بات وہ کہہ رہا ہو اس پر سرتاسر خود عامل بھی ہو ـــــ یہ مفہوم و مطلب ہوا ان دو باتوں کا کہ: مَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا ـــــ آگے تیسری بات یہ فرمائی: وَقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ "اور کہے میں بھی مسلمانوں میں سے ہوں ـــ کوئی نیا فرقہ نہ بنایا جائے۔ بلکہ کہا جائے کہ میں بھی اللہ کے فرماں برداروں میں سے ایک ہوں ـــ میں بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں اور اللہ کی توحید پر ایمان رکھنے والوں میں سے ایک ہوں۔ میں بھی یوم جزا و سزا کا یقین رکھنے والوں میں سے ایک ہوں ـــ ان ہی باتوں کے اقرار کا نام اسلام ہے ـــــ ۔

اپنا علاحدہ ایک تشخص بنانا اور مسلمانوں میں ایک نئے فرقہ کی بنیاد ڈال دینا، اس سے بچنا چاہیئے ——— انفرادی توحید سے عملی توحید کی طرف پیش رفت کے ضمن میں دعوت الی اللہ کا مرحلہ سورۂ حٰمٓ السجدہ میں آیا۔ اب آئیے سورۂ شوریٰ کی طرف ——!

توحیدِ عملی کی چوٹی : فریضۂ اقامتِ دین

میں نے آغاز میں سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ کی تلاوت کی تھی۔ اب میں اس کی کچھ تشریح اور توضیح کروں گا۔ اس طرح ان شاء اللہ وہ تمہیدی باتیں اختتام کو پہنچ جائیں گی جو آج کی نشست میں آپ کے سامنے بیان کرنا میرے پیشِ نظر تھیں۔ کل اور پرسوں ان شاء اللہ ہم باقاعدہ درس کے انداز میں سورۂ شوریٰ کے بعض مقامات کا مطالعہ کریں گے ——— میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اس آیت کریمہ کے مطالب و مفاہیم کو پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ سماعت فرمائیں اس لئے کہ یہ آیت کریمہ اس سورہ کی مرکزی آیت اور اس کا عمود ہے۔ تمہید چلی تھی انفرادی توحید سے کہ انسان اللہ کا بندہ بن جائے۔ اس کے لئے اپنی بندگی اور پرستش کو خالص کرتے ہوئے۔ پھر عملی توحید کی طرف پیش رفت کا پہلا مرحلہ ہے دعوت الی اللہ۔ توحید کی طرف لوگوں کو پکارنا اور بلانا اور اس کا منتہا ہے اس امر کی جان و مال سے جدّ و جہد کہ اجتماعی زندگی اور نظام پر بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کی توحید کا سکّہ رواں ہو جائے۔ یہ ہے اقامتِ دین، دین کو بالفعل قائم اور نافذ کرنا۔

آیتِ مبارکہ پھر سماعت فرمائیے :

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ——— بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝

تشریح و توضیح

فرمایا : شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ ۔ "مقرر کیا ہے تمہارے لئے دین" یہاں غور کیجئے کہ خطاب کن سے ہو رہا ہے! کن سے کہا جا رہا ہے کہ تمہارے لئے "اَلدِّيْن" مقرر کیا ہے!! ظاہر بات ہے کہ جو مخاطب ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور قرآن مجید کے ۔ وہی مخاطب ہیں اس آیتِ مبارکہ کے ۔ یہاں جمع کے صیغہ میں ضمیرِ مخاطب "کُمْ" آیا ہے ۔ یعنی تم سب کے لئے ۔

امت کا جامع اور ہمہ گیر مفہوم

شاید آپ کے علم میں یہ ضروری بات ہو! نہ ہو تو نوٹ کر لیجئے ۔ وہ یہ کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہیں تو اس میں ایک جزوی غلطی ہے ۔ نبی اکرمؐ کی امتِ دعوت ہے پوری نوعِ انسانی ۔ آپ تاقیامِ قیامت ہر مکان و زمان کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں بفحوائے آیاتِ قرآنیہ: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا اور وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ــــ لہٰذا پوری نوعِ انسانی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی "امتِ دعوت" ہے ۔ جن لوگوں نے آں حضورؐ کی دعوت کو قبول کر لیا یا آئندہ کریں وہ "امتِ اجابت" میں شامل ہیں یا ہو جائیں گے ۔ امتِ اجابت کے معنی ہوں گے تصدیق و تسلیم کرنے والی امت ــــ ہمارا حال کچھ بین بین ہے ۔ عملاً تو ہم نے قبول کیا ہوا نہیں ہے ۔ عملاً تو ہم نام کے اور نسلی مسلمان ہیں ۔ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ ہماری عظیم اکثریت فرائضِ دینی کی تارک اور شعائرِ دینی کی پابندی سے عاری ہے ۔ نفس پرستی، زر پرستی، قبر پرستی، تعزیہ پرستی اور نہ معلوم کتنی اور پرستیوں میں مبتلا ہے، زمانے کے چلن کی پرستش ہے ۔ نظریاتی سطح پر ملحدانہ اور مادہ پرستانہ کئی نظریات ہمارے فہیم طبقے کے قلب و ذہن پر مستولی ہیں ــــ ان اعتبارات کے پیشِ نظر ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر فی الواقع اور بالفعل لبیک کہا ہے ! البتہ ہم دعویدار اس بات کے ضرور ہیں کہ ہم جیسے کچھ بھی ہیں بہرحال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا اور آں حضورؐ کے امتی ہیں ــــ

امتِ دعوت اور امتِ اجابت

پس امت کے لفظ کو آپ سمجھ لیجئے کہ جو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن حکیم کا مخاطب ہے وہ امتِ دعوت میں سے ہے اور جو بھی اس دعوت پر لبیک کہہ کر اور اس کو قبول کر کے اس میں شامل ہو گیا وہ امتِ اجابت میں سے ہے ۔ امتِ اجابت کو قرآن حکیم فرقان حمید يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے خطاب کرتا ہے ــــ ان دونوں ہی سے سورۂ شوریٰ کی اس آیت میں خطاب ہے ــــ اب آئیے اس آیت کی تشریح و توضیح کی طرف :

آیت کی تفہیم و تصریح

فرمایا: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ "(لوگو !) تمہارے لئے اللہ نے وہی دین مقرر کیا ہے" ۔ کونسا دین ــــ؟

مَا وَصّٰی بِہٖ نُوْحًا "جس کی اس نے وصیت کی تھی نوحؑ کو"۔ وَالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ "اور جو ہم نے وحی کیا ہے (اے محمدؐ) آپ کی طرف"۔ یہاں اِلَیْکَ واحد کا صیغہ ہے۔ لہٰذا مراد ہوں گے محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖٓ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی۔ "اور جس کی وصیت کی تھی ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو" (علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام) پہلی بات تو یہ نوٹ کیجئے کہ یہاں پانچ رسولوں کا ذکر آیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور حضرات نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کا۔ اور یہی وہ پانچ رسول ہیں جن کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ یہ اولوالعزم من الرسل ہیں۔ بعض علما اس فہرست میں حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام کو بھی شامل کرتے ہیں لیکن علمائے سلف کی اکثریت کا رجحان ان ہی پانچ رسولوں کی طرف ہے جن کا ذکر یہاں آیا ہے۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر حضورؐ سے خطاب کر کے فرمایا گیا ہے۔ فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ۔ اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) صبر کیجئے جیسے ہمارے باہمت (صاحب عزیمت) رسول صبر کرتے رہے ہیں۔ یہاں اولوالعزم رسولوں سے یہی رسلؑ مراد ہیں۔ آیت کے اس ٹکڑے میں دوسری اہم بات یہ بیان ہوئی کہ ان سب رسولوںؑ کا دینؐ ایک ہی ہے۔ جو دین جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے، وہی دین لے کر آئے حضرت نوح علیہ السلام۔ وہی دین لے کر آئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ پس دین میں کوئی فرق نہیں۔ یہ بڑی اہم بات ہے اس کو نوٹ کیجئے۔ حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ رسولوں کی شریعتیں مختلف رہی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ نماز کی جو شکل ہمارے یہاں ہے یہ شکل شریعتِ موسوؑی میں نہیں تھی۔ روزے کے جو احکام ہمارے یہاں ہیں، وہ بنی اسرائیل کے روزوں کے احکام سے مختلف ہیں۔ لہٰذا شریعتوں میں فرق رہا ہے۔ البتہ دین ایک ہی رہا۔ اس بات کو نہیں سمجھیں گے تو اَقِیْمُوا الدِّیْنَ کا حقیقی مفہوم سمجھ میں نہیں آئے گا۔ اس لئے اس فرق کو اچھی طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔

جملہ انبیاء و رسل کا دین ایک ہی رہا ہے

تمام انبیاء و رسل کے مشترک دین کو واقعتاً ایک لفظ سے تعبیر کریں گے تو وہ ہوگا "دینِ توحید"۔ حضرت نوحؑ کا دور ہو، حضرت ابراہیم کا دور ہو، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کا دور ہو علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام اور نبی خاتم الرسل آخر الزماں جناب محمد صلی اللہ

علیہ وسلم کی دعوت ہے ۔ ان سب کا دین ایک ہی رہا ہے اور وہ ہے دینِ توحید۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جنابِ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی اور رسول اسی دعوتِ توحید پر مامور ہوتے رہے ہیں۔ توحید کی دعوت ایک نقطۂ واحدہ ہے اور سب کی دعوت میں مشترک۔ اس میں کسی دور میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ توحید کیا ہے؟ یہ کہ انسان کو ہر معاملہ میں اللہ کا حکم ماننا ہے اس کی ہدایت پر چلنا ہے۔ یہی تاکید جنّت سے حضرت آدمؑ کے ہبوطِ ارضی کے موقع پر کر دی گئی تھی۔ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ توحید کا اصل تقاضا یہ ہے کہ اس کی بھیجی ہوئی ہدایت اور اوامر و نواہی کے مطابق اس دنیا کی زندگی بسر کی جائے۔ تمام انبیاء و رسل کی دعوت کا مرکزی نقطہ یہی توحید رہا ہے ___ قرآن مجید میں جن انبیاء و رُسُل کا ذکر آیا ہے آپ ان سب کو پڑھ جائیے سب کی دعوت یہی ملے گی کہ: اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۔

شریعتیں جدا رہی ہیں

البتہ شریعت کے احکام بدلتے رہے ہیں۔ اللہ کا حکم ایک وقت میں ایک ہے دوسرے وقت میں دوسرا ہے۔ حکم بدل گیا۔ توحید وہی ہے۔ اُس وقت اُس حکم کی اطاعت کر لینا توحید تھی، اِس وقت اِس حکم کی تعمیل کرنا توحید ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لئے مختلف شریعتوں کے فرق کو بیان کرنے کے بجائے خود نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ سے میں ایک مثال پیش کرتا ہوں جس سے ان شاءاللہ بات واضح طور پر سمجھ میں آجائے گی۔ آپ سب حضرات کو یقیناً معلوم ہوگا کہ ہجرت کے بعد تقریباً سولہ مہینے آں حضورؐ نے بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی تا آنکہ حکم آگیا: فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ "پس اب پھیر دیجئے اپنے چہرے کو مسجد حرام کی طرف ___" بعض صحابہ کرامؓ میں ایک بےچینی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس لئے کہ ان کو خوب اندازہ تھا کہ نماز تو عِمَادُ الدِّيْن ہے۔ دین کا ستون ہے۔ رکنِ رکین ہے۔ بلکہ ایمان اور کفر میں امتیاز کرنیوالی چیز درحقیقت یہ صلوٰۃ ہے۔ اس کی دین میں اتنی اہمیت ہے۔ ان کو خیال آیا کہ اگر سولہ مہینے ہم نے غلط رُخ پر نماز پڑھی تو ہماری ان نمازوں کا کیا ہوگا؟ دوسرے یہ کہ اس دوران جن مسلمانوں کا انتقال ہوگیا اب ان کا کیا ہوگا۔؟ پس منظر میں یہ تشویش موجود تھی جس کے ازالے کے لئے اسی مقام پر یہ الفاظ آئے ہیں: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ "اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان ضائع کرنے والا نہیں ہے" فکر نہ کرو اُس وقت تم نے اگر بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے

نماز پڑھی تو حکم خداوندی وہی تھا۔ اِس وقت اسی اللہ کا حکم یہ ہے کہ مسجدِ حرام کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھو۔ تو اُس وقت توحید کا تقاضا وہ تھا اِس وقت اسی توحید کا تقاضا یہ ہے۔ حکم بدل سکتا ہے اصول نہیں بدلے گا۔ اصول یہ ہے کہ اللہ کے حکم پر چلنا ہے۔ جس وقت جو حکم ہے اسے ماننا ہوگا۔ اسی طریقے سے دوسری مثال سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام میں دیکھئے۔ مکّی دور میں حکم ہے کہ مشرکین اگر تمہیں دہکتے انگاروں پر لٹا رہے ہیں تو جھیلو، برداشت کرو۔ ہاتھ مت اٹھاؤ۔ اس وقت اس حکم کی اطاعت کرنا اللہ کی اطاعت تھی۔ مدنی دور میں آکر حکم ہوا ہے: وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ۔ "اور جنگ کرو اللہ کے راستے میں، ان سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔" اب اِس حکم پر عمل کرنا توحید ہے، اللہ کی اطاعت ہے۔ اللہ کی اطاعت وہاں وہ تھی یہاں یہ ہے۔ اللہ کی اطاعت کا اصول قائم رہے گا اگرچہ حکم بدل گیا۔ حضرت نوح علیہ السّلام کی شریعت کچھ اور تھی جس کا ہمارے پاس کوئی ریکارڈ نہیں۔ ہمارے پاس اگر ریکارڈ ہے تو وہ شریعتِ موسوؑی کا ہے اور ان شریعتوں کے فرق کو عام طور پر لوگ جانتے ہیں بس شریعتیں بدلی ہیں، جدا رہی ہیں۔ قرآن مجید میں ایک جگہ یہ الفاظ بھی آئے ہیں: لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَۃً وَّمِنْھَاجًا۔ "ہم نے (تم انسانوں میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور راہِ عمل مقرر کی" سابقہ امتیں اگر ان کو دی ہوئی شریعتوں پر کاربند رہیں تو انہوں نے توحید کا تقاضا پورا کیا۔ اب شریعتِ محمدی۔۔ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام۔۔ پچھلی تمام شریعتوں کی ناسخ ہے۔ اب اس پر چلنا توحید اور اطاعتِ الٰہی کا تقاضا ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ تورات کا ایک نسخہ لے آئے تھے اور اس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے پڑھنا شروع کیا۔ (میرا یہ گمان ہے کہ وہ کسی مسئلہ میں دلیل کے طور پر تورات کو پڑھ رہے تھے اور حضورؐ کو سنا رہے تھے)۔ وہ تو پڑھنے میں لگے رہے اور انؓ کو اندازہ نہیں ہوا کہ حضورؐ کے چہرۂ مبارک پر ناراضگی کے آثار ہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قریب تھے انہوں نے حضرت عمرؓ کو ٹوکا "دیکھتے نہیں ہو کہ حضورؐ کے چہرۂ مبارک کا کیا حال ہے!" حضرت عمرؓ نے نگاہ اٹھا کر دیکھا اور ان کو حضورؐ کے چہرۂ انور پر خفگی کے آثار نظر آئے تو فوراً انکی زبان پر یہ الفاظ جاری ہوگئے: رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّبِمُحَمَّدٍ رَّسُوْلًا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا۔ تین بار انہوں ان الفاظ کا اعادہ کیا۔ یہاں تک کہ حضورؐ کا غصّہ فرو ہوا اور پھر حضورؐ نے فرمایا "اے عمرؓ! اگر موسیٰؑ بھی اس وقت زندہ ہوتے تو ان کو بھی

میری اطاعت کئے بغیر چارہ نہیں تھا" اَوْ کَمَا قَالَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے کہ تمام سابقہ شریعتیں شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے آنے کے بعد منسوخ ہو چکی ہیں ـــــ اس ساری گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگرچہ انبیاء و رسل؊ کی شریعتیں مختلف رہی ہیں۔ تاہم دین ایک ہی رہا ہے اور وہ ہے "دین توحید"۔

دین اور شریعت میں ربط و تعلق

اب میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلہ کو بھی جدید اصطلاحات سے سمجھ لیا جائے کہ دین اور شریعت میں کیا ربط و تعلق ہے۔! دیکھئے جدید سیاسیات میں دو اصطلاحات رائج ہیں۔ ایک دستور (CONSTITUTION) دوسرا قانون (LAW)۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ دستور (CONSTITUTION) وہ دستاویز ہے جو کسی بھی معاشرے کے نظام کو متعین کرتی ہے۔ اساسی دستور میں طے ہوتا ہے کہ اس ملک میں حاکمیت ...ن ہے (SOVEREIGN) کون ہے! اور حاکمیت کس طرح استعمال (CHANNELISE) ہوگی: وہ رو بعمل (EXERCISE) کس طور پر ہوگی۔ اس دستور کے تحت قانون سازی کا طریقہ (PROCESS) کیا ہوگا۔! اس میں رد و بدل کیسے ہوگا! انتظامیہ اور عدلیہ میں باہمی ربط و تعلق کیا ہوگا۔! ایک دوسرے کے محاسبہ اور توازن (CHECKS BALLANCES) کا نظام کیا ہوگا! ان بنیادی مسائل کے لئے رہنمائی دینے والی دستاویز اساسی دستور کہلائی جاتی ہے۔ ہر ملک کے دستور میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ اساسی دفعات بہت پائیدار اور مضبوط ہوں چونکہ بار بار ترمیم مناسب نہیں ہوتی لہٰذا تبدیلی کا طریقہ (PROCESS) مشکل ترین رکھا جاتا ہے۔ اس دستور کے تحت حسب ضرورت اکثریت کی رائے سے قانون سازی ہوتی رہتی ہے اور قانون (رفتہ رفتہ) اور ۵۱ فیصد آراء کے فرق سے ہر وقت تبدیل بھی ہو سکتا ہے۔ ایک وقت میں لیجسلیٹو اسمبلی یا پارلیمنٹ ایک قانون منظور کرتی ہے اور دوسرے وقت میں اس کو تبدیل کر دیتی ہے یا اس میں ترمیم (AMENDMENT) کر دیتی ہے۔ وہ چھپ جاتی ہے اور وکلاء حضرات اس کے قانون کی کتاب میں چیپیاں لگاتے رہتے ہیں ـــــ ان دونوں اصطلاحات سے یہ بات سمجھ لیجئے کہ دستور کی حیثیت ہے دین کی اور قانون کی حیثیت ہے شریعت کی۔

لفظ دین کا مفہوم

آگے بڑھنے سے قبل میں چاہوں گا کہ اسی موقع پر لفظ دین کے مفہوم کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ جس کی تشریح میں نے ابتدائی گفتگو میں مؤخر کی تھی۔ عربی میں دین کے لغوی معنی ہیں "بدلہ"۔ ظاہر ہے کہ بدلہ کسی کام کے نتیجہ کے طور پر ملتا ہے۔

اچھے کام کا اچھا اور بُرے کام کا بُرا بدلہ ـــــ لہٰذا لفظِ دین میں جزا و سزا کا مفہوم پیدا ہوا۔ اس مفہوم سے لفظِ دین میں قانون اور ضابطہ کا تصوّر شامل ہوا۔ چونکہ جزا اور سزا مستلزم ہے کسی قانون اور ضابطہ کو ـــــ اس تصوّر کے مقتضیات و لوازم کے طور پر اسی لفظِ دین میں ایک مقنّن اور مطاع کا مفہوم داخل ہوا۔ اب بدلہ، جزا و سزا، قانون و ضابطہ اور مقنّن و مطاع کے تمام مفاہیم کو جمع کیجئے تو حاصل جمع ہوگا اطاعت۔ لہٰذا ان تمام مطالب و مفاہیم اور تصوّرات کے اجتماع سے قرآن مجید کی اصطلاح "دین" بنی۔

دین کے معنی ہوئے ایک دستور۔ ایک پورا نظامِ حیات۔ ایک مکمل ضابطہ زندگی جس میں ایک ہستی یا ادارے کو مطاع، مقنّن اور حاکم مطلق تسلیم کر کے اس کی جزا کی امید اور سزا کے خوف سے اس کے عطا کردہ یا جاری و نافذ کردہ قانون اور ضابطہ کے مطابق اس ہستی یا ادارے کی کامل اطاعت کرنا ـــــ

ان تمام مفاہیم کو قرآن مجید میں ان الفاظ مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ بلاشبہ اللہ کا پسند کردہ نظام حیات تو اسلام یعنی مکمل تابع داری ہے یہاں دین اور اسلام کے فرق کو بھی سمجھ لیجئے۔ "اَلدِّین" کے معنی یہاں ہیں "نظامِ حیات و اطاعت اور الاسلام کے معنی ہوں گے تابعداری اور فرمانبرداری کرتے ہوئے زندگی بسر کرنا۔ نظامِ حیات اور دستور کے معنی میں یہ لفظِ دین سورۂ نصر میں استعمال ہوا۔ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ـــــ غیر اللہ کے بنائے ہوئے نظامِ حیات پر بھی اسی 'دین' کی اصطلاح کا اطلاق ہوگا۔ جیسے سورۂ یوسف میں بادشاہ کے رائج نظام کے لئے دین الملک استعمال ہوا۔ چونکہ ملوکیت میں حاکمیتِ مطلقہ بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ کسی تحدید کا پابند نہیں ہوتا ـــــ

دستور و قانون کا تعلق

اب پھر رجوع کیجئے اس بات کی طرف کہ دستور تو اصل میں نظام کو طے کرتا ہے۔ اور اس نظام کے تحت قانون کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ لہٰذا دستور کی حیثیت ہے دین کی اور قانون کی حیثیت ہے شریعت کی۔ دستور طے کرتا ہے کہ حاکمیت کس کی ہے، اطاعتِ مطلقہ کس کی ہوگی۔ قانون سازی کا آخری اختیار کس کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ کے دین میں حاکمیتِ مطلقہ صرف اور صرف اللہ کے لئے ہے۔ اطاعتِ مطلقہ کی سزاوار اسی کی ذاتِ عزّ وجلّ ہے۔ اس کی قائم کردہ حدود کے اندر اندر رہتے ہوئے اسلامی ملک کی پارلیمنٹ کو قانون سازی کا حق حاصل ہے۔

جمہوریت ہمارے دور میں سب سے زیادہ مقبول اور رد عمل نظام جمہوریت ہے۔ گویا آج کل سب سے زیادہ رواں جمہوریت کا سکہ ہے ع سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ! یہاں "آتا" کو "آیا" سے بدل دیجئے تو یہ دور جمہوریت کا دور ہے۔ یہ بھی ایک دین ہے۔ دینِ جمہور۔ اسکی اصل یہ ہے کہ حاکمیتِ مطلقہ عوام کی ہے عوام کے منتخب کردہ نمائندے جو چاہیں گے قانون بنائیں گے۔ انہیں اختیار ہے کہ شراب پہ پابندی لگائیں یا اسے ھنیئاً مریئاً قرار دیں۔ ان کو اختیار ہے کہ زنا پہ کوئی سزا طے کریں یا اس کی کھلی چھوٹ دے دیں۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ بعض مغربی ممالک میں لواطت کو نہ صرف جائز قرار دیا گیا ہے بلکہ (HOMOSEXUALITY) کو اس طرح قانونی تحفظ دیا گیا ہے کہ دو مرد بھی آپس میں شوہر اور بیوی کا رشتہ قائم کر کے رہ سکتے ہیں۔ قانون اُن سے کوئی تعرض نہیں کرے گا۔ چونکہ ان کا قانون اسے جائز رشتہ ازدواج میں منسلک قرار دیتا ہے ان پہ شوہر اور بیوی کے تمام حقوق و فرائض کا اطلاق ہوگا۔ یہ ہے جمہوریت جس میں حاکمیتِ مطلقہ عوام کے ہاتھ میں ہے۔ ان کے نمائندے جو چاہیں قانون بنائیں۔ ان پہ کوئی تحدید نہیں ہے۔

دین اللہ دین الملک اور دین الجمہور کے مقابلے میں دین اللہ، دین اسلام کیا ہے؟ وہ یہ کہ مطاعِ مطلق ہے اللہ۔ قانون سازی کا مطلقاً اختیار اللہ کو ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔ "حکمرانی اور فرماں روائی کا کلیتہً اختیار صرف اللہ کے لئے ہے۔ اس تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ صرف اسی کی بندگی کی جائے گی۔ اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں ہوگی۔ اسی طرزِ عمل اور رویّہ کا نام دینِ قیّم ہے۔" اسلامی مملکت میں اللہ کی حاکمیّتِ مطلقہ تسلیم کی جائے گی۔ اور اللہ کے نازل کردہ دین و شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے حسبِ ضرورت قانون سازی ہوتی رہے گی۔ اصولِ دین سے کسی حال میں سرِمو انحراف نہیں کیا جائے گا۔

ہمارے دستور کی قراردادِ مقاصد آج صبح میں نے اخبار میں دیکھا کہ آج مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی برسی کا دن تھا۔ میں تو برسی کا قطعی قائل نہیں ہوں لیکن اس لحاظ سے بات ذہن میں بیٹھ گئی کہ آج اخبارات نے مولانا مرحوم کی چند دوسرے اہلِ علم و دانش کے تعاون سے مرتب کردہ اس قراردادِ مقاصد کا متن بھی شائع کیا جو ۱۹۴۹ء میں پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے منظور کی تھی۔ جو ۷۳ء کے دستور تک ہر دستور میں بطور افتتاحیہ شامل ہے۔ اس قرارداد میں بات طے کی گئی تھی کہ اس

سلطنت خداداد میں حاکمیت اللہ کی ہے اور عوام کے منتخب نمائندے اس کے نائب کی حیثیت سے امور و کاروبارِ حکومت چلائیں گے۔ وہ بہت اہم اور بڑا فیصلہ تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ فیصلہ دل سے کیا نہیں گیا تھا۔ یہ تو مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی شخصیت، ان کی علمیت، ان کی وجاہت اور ان کا پاکستان کی تحریک میں بھرپور حصہ پھر عوام و خواص میں ان کی عزت و احترام اور ان کا اثر و رسوخ ان سب باتوں کا رعب اتنا تھا۔ پھر یہ کہ نواب لیاقت علی خاں مرحوم خود بھی مولانا کے کچھ زیرِ اثر تھے لہٰذا قراردادِ مقاصد پاس ہو گئی۔ ورنہ مجھے امید ہے کہ اس مجلس میں چند لوگ ایسے ضرور ہوں گے جن کو یاد ہوگا کہ قراردادِ مقاصد کے منظور ہونے کے بعد دستور ساز اسمبلی میں کچھ نام نہاد مسلمانوں ہی نے کھڑے ہو کر یہ کہا تھا کہ اس قرارداد کے پاس ہونے پر آج ہماری گردنیں شرم کے مارے جھک گئی ہیں آج ہم مہذب دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے، اصل بات چونکہ دل سے نہیں نکلی تھی۔ اندر خاص شخصیتوں کے دباؤ تھے پھر خارج میں جماعتِ اسلامی کی برپا کردہ اسلامی دستور کی تدوین کے لئے کافی مؤثر تحریک تھی جس کے نتیجہ میں اسمبلی میں خطوط، پوسٹ کارڈز اور تاروں نیز مختلف پلیٹ فارموں سے منظور شدہ مطالبوں کی قراردادوں کی نقول سے بوریوں پر بوریاں بھر گئی تھیں اور ان کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ملک نیا نیا بنا تھا۔ عوامی دباؤ کا بھی یہ نیا تجربہ تھا۔ لہٰذا برسرِ اقتدار لوگ اس عوامی تحریک سے بھی کافی مرعوب ہو گئے تھے۔ رائے عامہ کا ظہور جس قدر بڑے پیمانے پر ہوا تھا اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ قراردادِ مقاصد منظور تو ہو گئی لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ کام خارجی دباؤ کے تحت ہوا تھا۔ اصل میں دل سے یہ بات نہیں نکلی تھی۔ لہٰذا وہ صفحۂ قرطاس کی زینت تو بن گئی لیکن اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے جو پیش رفت ہونی چاہیئے تھی وہ نہیں ہوئی نہ اس وقت ہوئی نہ آج تک ہوئی ہے۔

ایک کثیفہ اس ضمن میں ایک لطیفہ بلکہ کثیفہ میں آپ کو سناتا ہوں۔ ایک صاحب جو اس وقت اسلامی جمعیت طلبہ میں شامل تھے اور مجھ سے بڑے تھے۔ اب بھی حیات ہیں اور اب ایک نامور سیاسی لیڈر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ لاہور میں مستقل طور پر رہتے ہیں۔ میں ان کا نام نہیں بتانا چاہتا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ لاہور کی مال روڈ پہ جا رہے تھے تو ایک بڑی سی کار پاس سے گذری اور ایک بہت لمبی داڑھی والے ایک صاحب اس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے توجہ سے دیکھا کہ کون ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کیا دیکھتے ہو؟ یہ "قراردادِ

مقاصد" ہے۔ میں بڑا حیران ہوا اور میں نے کہا کیا کہہ رہے ہو؟ وہ کار والے صاحب سے ذاتی طور پر واقف تھے۔ انہوں نے کہا کہ "ان کو لوگ "قرارداد مقاصد" کہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کیوں؟ بولے "جس طرح قرارداد مقاصد کی ہمارے ملک میں کوئی حیثیت نہیں ہے ویسے ہی ان صاحب کے کردار میں اس داڑھی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اپنے کردار کے لحاظ سے یہ نہایت بدنام شخص ہے جو ابھی کار میں گزرا ہے لیکن یہ کہ دینداری کے اظہار کے لئے بڑی سی داڑھی رکھی ہوئی ہے بالکل اسطرح جیسے قرارداد مقاصد کی حیثیت محض ایک دکھاوے کی چیز کے سوا اور کچھ نہیں" ان کی بات صدفی صد درست ثابت ہوئی۔ اس لئے کہ پینتیس ۳۵ سال تو گزر چکے ہیں چھتیسواں سال شروع ہو چکا ہے۔ اس عرصہ میں اس قرارداد پر جو کچھ عمل ہوا ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ لیکن فی الواقع اس قرارداد مقاصد پر اور اُس دفعہ پر جو ہر دستور میں محض رہنما اصول (DIRECTIVE PRINCIPLE) کے طور پر درج ہوتی چلی آرہی ہے۔ کسی دستور میں بھی اُسے نافذ العمل دفعہ (OPERATIVE CLAUSE) قرار نہیں دیا گیا۔ وہ رہنما اصول یہ ہے کہ:

(NO LEGISLATION WILL BE DONE REPUGNANT TO THE QURAN & THE SUNNAH)

"کوئی قانون سازی نہیں ہوگی جو قرآن و سنت کے خلاف ہو۔"

اسلامی نظام کے مقتضیات

اگر قرارداد مقاصد اور یہ رہنما اصول (OPERATIVE CLAUSE) نافذ العمل دفعہ بن جاتے اور یہ دونوں واقعی اخلاص کے ساتھ صاحب اقتدار حضرات کے دلوں میں اتر جائیں۔ پھر ملک کی تمام ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ کو کھلا اختیار دے دیا جائے کہ اس ملک کا رہنے والا ہر مسلمان اس دفعہ کے تحت جس قانون کو بھی چیلنج کرے کہ قرآن و سنت کے خلاف ہے تو وہ عدالتیں اس کو سنیں اور فیصلہ دیں۔ یہ دونوں چیزیں کسی ملک کے دستور اور نظام کو اسلامی دستور اور نظام بنانے کے لئے کفایت کریں گی۔ باقی رہی یہ بات کہ انتخابات کا طریقہ و نہج کیا ہو! وہ جماعتی بنیاد پر ہو، متناسب نمائندگی کے اصول پر یا غیر جماعتی ہو۔ ملک کا نظام پارلیمانی ہو یا صدارتی ہو۔ وحدانی ہو یا وفاقی یا الحاقی ہو۔ یہ سارے مسائل مباحات کے دائرے کے ہیں۔ ہمارے ملک کے حالات کے اعتبار و لحاظ سے جو طریقہ مناسب نظر آئے اسے اختیار کر لیا جائے۔ اصل چیز یہ ہے کہ ملک کا نظام، توحید پر استوار اور مبنی ہو۔ نظری طور پر تسلیم کیجئے اور عمل میں اس کا مظاہرہ کیجئے کہ حاکمیت کا اختیار صرف اللہ کا ہے۔ نظری طور پر یہ بات

قراردادِ مقاصد میں موجود ہے اور عملاً اس رہنما اصول کو نافذ العمل دفعہ بنانے کی ضرورت ہے کہ:

(NO LEGISLATIVE WILL BE DONE REPUGNANT TO THE QURAN ▮ THE SUNNAH)

قانون سازی کا ہمیں اختیار رہے لیکن یہ اختیار محدود ہے۔ ہم اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے اندر اندر اور ان کی روح کے مطابق قانون بنا سکتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام میں ردّوبدل کرنے کے ہم ہرگز اور قطعی مجاز نہیں ہیں۔ نہ ان سے تجاوز کر سکتے ہیں۔ تِلْكَ حُدُوْدُ اللهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا۔ ایک جگہ آتا ہے: تِلْكَ حُدُوْدُ اللهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا "یہ اللہ کی حدود ہیں ان سے تجاوز نہ کرو۔" اور "یہ اللہ کی حدود ہیں ان کے قریب بھی نہ پھٹکو۔"[1] اس دائرے کے اندر آپ قانون بنائیے۔ اس کے لئے بھی قرآن نے ان الفاظ مبارکہ میں ہدایت دیدی ہے: وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ اپنے معاملات باہمی مشورے سے طے کریں۔ کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بلکہ مطلوب ہے واجب ہے کہ معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں۔

قابلِ صد افسوس بات آپ کو معلوم ہے کہ اس دور میں شرعی عدالتیں بنی ہیں، لیکن حال کیا ہے؟ ان کے بھی ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، ان کو حکم ہے کہ كُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ "اپنے ہاتھ بندھے رکھو۔" فلاں فلاں قوانین کی طرف ہرگز نگاہ ▮ نہ اٹھانا۔ عائلی قوانین ان شرعی عدالتوں کے حیطۂ اختیار سے باہر ہیں۔ ان پر فیصلہ کرنے کی یہ عدالتیں

---

[1] ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ ایک بندۂ مومن کے اختیار کی کیفیت اس گھوڑے کے مانند ہے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہو۔ اب جتنی لمبی رسّی ہے اسی قدر وہ اس کھونٹے کے چاروں طرف جا سکے گا۔ اس رسّی سے تجاوز نہیں کر سکے گا۔ یہی طرزِ عمل ایک مومن بندے کا ہونا چاہیئے۔ (اوکما قال) اس سے ایک صحیح اسلامی ریاست کی حدود اختیارات کو سمجھا جا سکتا ہے ___ اسلامی ریاست میں اختیارات کی حدبندی کے لئے سورۃ الحجرات کی یہ آیتِ کریمہ رہنمائی کرتی ہے کہ: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ▮ "اے اہلِ ایمان! اللہ اور اس کے رسولؐ کے آگے (یعنی ان کے احکام سے) پیش قدمی نہ کرو اور اللہ کی نافرمانی سے بچو۔ اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔" اس آیت کی رو سے ایک اسلامی ریاست کو لازماً اللہ کی کتاب اور اسکے رسولؐ کی سنّت کے تابع ہو کر کاروبارِ حکومت چلانا ہوگا۔ (مرتب)

مجاز نہیں کہ ان میں شریعت کے خلاف کون کون سی دفعات ہیں۔ ان عائلی قوانین کو صاحب اقتدار حضرات کا تحفظ حاصل ہے۔ چونکہ ڈر ہے کہ اگر ان میں سے خلاف شرع دفعات حذف کر دی گئیں تو مغرب زدہ خواتین ناراض ہو جائیں گی۔ گویا ان کی ناراضگی کا اللہ کی ناراضگی سے زیادہ خوف ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ ان کی رضا اللہ کی مرضی و رضا سے زیادہ عزیز ہے۔ ان شرعی عدالتوں کو اس امر کا پابند بھی کر دیا گیا ہے کہ یہ مالی قوانین کے بارے میں بھی فیصلے دینے کی مجاز نہیں ہیں کہ کون سے قوانین اور طور طریقے خلافِ اسلام ہیں۔ حالانکہ آپ کو معلوم ہے کہ اہم ترین نظام تو مالیات کا نظام ہی ہوتا ہے۔ آج کی دنیا میں سارا دار و مدار تو معاشی نظام پر ہے۔ وہ طے کرتا ہے کہ پورا نظام کن اصولوں پر چلے گا ـــ آپ کو بہ ادنیٰ تامل نظر آجائے گا کہ ہمارے پورے نظام معیشت کا دار و مدار حرام پر ہے۔ ہماری تمام بڑی بڑی صنعتیں اور ہماری تمام برآمدی و درآمدی تجارت سود کی بنیاد پر چل رہی ہے۔ ہماری زمین یعنی کاشت کاری کا اکثر و بیشتر بندوبست جاگیرداری اور زمینداری کی بنیاد پر چل رہا ہے۔ ایک ہے صنعت و تجارت کا سود اور ایک ہے زمین کا سود۔ معیشت کا کل کا کل معاملہ سود کی بنیاد پر چل رہا ہے۔ لیکن شرعی عدالتوں کے ہاتھ باندھ دیئے گئے کہ وہ ان مسائل کے متعلق کوئی (VERDICT) نہیں دے سکتیں۔ ہو سکتا ہے کہ چند اور بھی مسائل ہوں جو ان عدالتوں کے حیطۂ اختیار سے باہر رکھے گئے ہوں۔ بہرحال عائلی قوانین اور مالی قوانین پر یہ عدالتیں کسی غور و فیصلہ کی مجاز نہیں ہیں۔ ان امور کو اگر دین کے تابع نہیں کیا گیا تو گویا بنیادی باتوں ہی سے اعراض و گریز کیا جا رہا ہے۔ پھر اسلام آئے گا تو کیسے آئے گا۔ اگر اسلام کو فی الواقع لانا ہے تو ان سب کو بدلنا ہو گا۔

آیت کی مزید توضیح و تشریح

یہ باتیں تو جملہ ہائے معترضہ کے طور پر درمیان میں آگئیں اب آئیے سورہ شوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ کی طرف۔ میں نے اس آیت کی ابھی تک صرف دو باتوں کی شرح کی ہے۔ ایک تو یہ کہ ان پانچوں رسولوں کا دین ایک ہے۔ اور یہ پانچوں چوٹی کے رسول ہیں ـــــــــــــــ معلوم ہوا کہ تمام انبیاء و رسل کا دین ایک ہی رہا ہے۔ از آدم علیہ السلام تا ایں دم۔ دینِ الٰہی ایک ہے۔ یہ دین کیا ہے؟ یہ ہے فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ۔ انفرادی سطح پر اور اجتماعی سطح پر یہ بات مانو کہ اللہ ہی ہے حاکمِ مطلق۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ اسی کے قانون کی تنفیذ ہو۔ جہاں اس تعالیٰ نے آزادی دے رکھی ہو وہاں تم حدود میں رہ کر قانون بنا سکتے ہو۔ یہ اسی کی دی ہوئی آزادی ہے۔ لیکن اس کی تر کردہ

حدود سے ہرگز تجاوز نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان میں ردّ و بدل کیا جا سکتا ہے۔ یہ ہوگا دین کو قائم کرنا یہ ہے اقامتِ دین۔ اس کو سمجھنے کے لئے اب آیت مبارکہ کے اگلے حصے پر آ جائیے۔ اس کیلئے آیت کا متعلقہ حصہ پھر سماعت فرمائیے! شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ۚ یہ دین اس لئے دیا گیا ہے کہ اس کو قائم کرو۔ اس لئے تو نہیں دیا گیا کہ اس کی مدح کرو۔ اس کی تعریفیں کرو۔ اس پر کانفرنسیں کرتے رہو۔ کانفرنسیں اور محاضرات قرآنی ہم بھی کرتے ہیں، لیکن اگر ان کانفرنسوں اور محاضرات سے مقصود ہو دین کو قائم کرنے کی جدوجہد میں کام لینا تو ان کا انعقاد مبارک۔ اور اگر یہ چیزیں اپنی جگہ مقصود و مطلوب بن جائیں اور گفتن و برخاستن تک معاملہ رہے تو ان کا کوئی حاصل نہیں۔ کسی پیشِ نظر عظیم کام کے لئے ہو تو یہ احسن کام ہے چونکہ ظاہر بات ہے کہ اس کے کچھ (PRACTICAL ASPECTS) ہوں گے۔ لہٰذا اصل مقصود ہی اس کام کا صحیح مقام متعین کرے گا۔ اقامتِ دین کی جدوجہد کے طور پر تبلیغ ہو رہی ہو تو وہ تبلیغ اور ہوگی۔ اور اگر تبلیغ برائے تبلیغ ہو رہی ہو تو وہ تبلیغ اور ہوگی۔ ان میں زمین و آسمان کا فرق ہو جائے گا جیسا کہ میں پچھلی مرتبہ عرض کر کے گیا تھا کہ ایک ہے خالص مذہبی طرز کی تبلیغ اور ایک تبلیغ ہے انقلابی تبلیغ۔ ایک تبلیغ وہ ہے جو صرف عقیدہ کو پھیلاتی ہے جیسے عیسائیت کی تبلیغ۔ وہاں نظام ہے ہی نہیں، دین ہے ہی نہیں شریعت موجود ہی نہیں ہے کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام! اس کے احکام موجود ہی نہیں ہیں۔ ان کے ہاں صرف عقیدہ ہے یا اخلاقیات کی کچھ تعلیم ہے۔ اخلاقیات (MORALITY) کے بارے میں ابتدا ہی میں میں نے بتایا تھا کہ سب کے نزدیک یہ مشترک چیزیں ہیں۔ ان کو (UNIVERSAL ETHICS) آفاقی اخلاقیات کہنا بجا ہوگا۔ شریعت ان کے ہاں سرے سے ہے نہیں تو نظام کیا بنے گا! لہٰذا ان کی تبلیغ صرف عقیدے اور چند اخلاقی اصولوں کی تبلیغ ہے جس طریقے سے ایک بیل ہوتی ہے جو وہ زمین پر پھیلتی ہے سرے سے اوپر اٹھتی ہی نہیں۔ وہ خربوزے کی ہو، کدو کی ہو، کسی چیز کی بھی ہو وہ زمین پر ہی رہ جائے گی۔ اوپر نہیں اٹھے گی۔ یہی مذہبی تبلیغ کا مزاج ہے کہ وہ زمین ہی پر پھیلتی چلی جاتی ہے۔ وہ کبھی نظام قائم نہیں کرتی نظام کا قیام اس کے پیشِ نظر ہوتا ہی نہیں لیکن انقلابی تبلیغ کسی نظام کو برپا کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ اس کی مثال ہمارے سامنے اشتراکی تبلیغ ہے۔ ایک اشتراکی اپنی جدوجہد اور تبلیغ کے ذریعے اپنے نظریات کو پھیلاتا ہے۔ لوگوں کو اپنا ہم خیال بناتا ہے۔ اپنا لٹریچر پھیلاتا ہے۔ غزلوں سے، نظموں سے،

افسانوں سے، ڈراموں سے اور بہت سے ذرائع سے وہ اپنے فکر کو پھیلانے کے لئے جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ پھر اس فکر کو قبول کرنے والوں کو منظم کرتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے پیشِ نظر انقلاب برپا کرنا ہے۔ اس کے پیشِ نظر ایک نظام ہے جسے وہ سمجھتا ہے کہ صحیح اور بہترین نظام ہے۔ وہ غلط سمجھتا ہے یا درست سمجھتا ہے اس سے قطع نظر وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ یہ وہ نظام ہے جو عدل پر مبنی ہے۔ وہ اس نظام کو برپا کرنے کے لئے تبلیغ کر رہا ہے۔ تو اس انقلابی تبلیغ میں اور اس مذہبی تبلیغ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کو آپ دیکھیں گے تو اس میں دونوں تبلیغیں آپ کو نظر آئیں گی۔ اللہ کی طرف دعوت بھی ہے۔ توحید کے عقیدے کی دعوت بھی ہے اور اقامتِ دین کی جدوجہد بھی ہے۔ نظام کو بدلنے کی سعی و کوشش بھی ہے۔ چنانچہ آگے چل کر جب ہم اس سورہ شوریٰ کی اگلی آیات پڑھیں گے تو ان میں ہمیں دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا یہ ہدف ملے گا۔ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ " اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پس آپ اس کی دعوت دیجئے"۔ یہاں فَلِذٰلِكَ فَادْعُ نہایت غور اور توجہ چاہتا ہے۔ دعوت کس چیز کی۔؟ دعوت اقامتِ دین کی ـــــ : اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ کی دعوت۔ دین کو بالفعل قائم کرنے کی دعوت۔ صرف عقیدے کی دعوت نہیں ہے۔ صرف اخلاقی تعلیم کی تبلیغ و تلقین نہیں ہے۔ صرف مراسمِ عبودیت کو پھیلانے کی تبلیغ نہیں ہے۔ ٹھیک ہے نماز، روزے اور دوسرے نیکی کے کاموں کی دین میں بڑی اہمیت ہے لیکن ان سب سے جو چیز مطلوب ہے وہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ اللہ کی توحید کو اجتماعی نظام پر قائم کرنے کے لئے ان سے مدد حاصل کی جائے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ "اے ایمان والو! مدد حاصل کرو (اللہ کی راہ میں مشکلات پر) صبر سے اور نماز سے ـــــ آگے جہاد فی سبیل اللہ کی جو چوٹی ہے یعنی قتال فی سبیل اللہ۔ اس کے اعلیٰ وارفع مقام کا ذکر ان الفاظِ مبارکہ سے کر دیا گیا: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ○ صبر وصلوٰۃ سے مدد کس مقصد کے لئے حاصل کرنی ہے! وہ مقصد ہے اقامتِ دین کی جدوجہد ـــــ!!

اسی کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا: فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ "پس اے نبیؐ اسی کی دعوت دیجئے اور جس چیز کا آپؐ کو حکم ہوا ہے اسی پر جم جائیے اور ان (مشرکوں) کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے" یہ ہے اقامتِ دین

اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ط

تفرقہ کیا ہے؟ وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔ لہٰذا میں اس وقت وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ کی اجمالی تشریح پر اکتفا کروں گا۔ ان شاء اللہ کل جب ہم باقاعدہ سورۂ شوریٰ کے بعض اہم مقامات کا باقاعدہ درس کی شکل میں مطالعہ کریں گے تو تفاصیل بیان ہوں گی۔ دیکھئے ایک لفظ ہے تفرقہ، تفریق اور ایک ہے اختلاف۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اختلاف بالکل نیک نیتی سے بھی ہو سکتا ہے۔ اختلاف جزوی ہوتا ہے۔ اختلاف کی وجہ سے یہ نہیں ہوتا کہ دین دیگرم تو دیگری، یہ تفرقہ ہو جائے گا۔ تفرقہ یہ ہے کہ ایک دوسرے سے کٹ جائیں۔ آپس میں پھٹ جائیں۔ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں۔ اختلاف تو امام ابوحنیفہ سے کیا امام شافعی نے (رحمہما اللہ) ــــ امام ابوحنیفہؒ کے بعض فتاویٰ سے اختلاف کیا ہے خود امام موصوفؒ کے شاگردوں نے ــــ امام محمدؒ اور امام قاضی ابویوسفؒ نے بعض مسائل میں امام رحمہ اللہ کی آراء سے اختلاف کیا کہ نہیں کیا۔ ! ایک امام دوسرے امام کی رائے، تعبیر اور فتویٰ سے اختلاف کر سکتا ہے ایک شاگرد اپنے استاذ کی رائے سے اختلاف کر سکتا ہے۔ ان سب کی نیتیں نیک ہیں، مبنی بر اخلاص ہیں۔ یہ سب دین الٰہی کا حکم اور اس کا منشاء قیاس اور اجتہاد کے ذریعے سے معلوم کرنا چاہ رہے ہیں لیکن چونکہ استنباط کے اصول میں کچھ اختلاف ہے۔ لہٰذا نتیجے مختلف نکل رہے ہیں۔ پس اختلاف نیک نیتی سے بھی ہو سکتا ہے۔ اختلاف کوئی بُری شے نہیں ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسی اختلاف سے دنیا کی رونقیں ہیں۔ ذوقؔ نے کہا ہے ؎

گلہائے رنگا رنگ سے ہے رونق چمن   اے ذوقؔ زیب اس چمن کو ہے اختلاف سے

ایک گلاب کا پودا ہے، اس میں جو پھول لگتے ہیں وہ سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہر ایک کا رنگ اور انداز جدا جدا ہوتا ہے۔ اسی طرح غور کیجئے کہ ایک ہی طرح کے تمام انسان ہوتے: رنگ ایک، شکل وصورت ایک، ناک نقشہ ایک تو کتنی اکتا دینے والی یکسانیت (MONOTONY) ہو جاتی۔ ایک دوسرے کو پہچاننا مشکل بلکہ قریب قریب ناممکن ہو جاتا۔

تفریق دین ایک نوع کا شرک ہے لیکن تفرقہ کے متعلق جان لیجئے کہ امت میں تفرقہ اور دین میں تفرقہ کو شرک کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ط (اے نبیؐ !) جو لوگ اپنے دین کو پھاڑ دیں، ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ اس میں تفرقہ ڈال دیں اور

گروہوں میں بٹ جائیں یقیناً (اے نبیؐ!) ان سے آپؐ کا کوئی تعلق نہیں ہے"۔ یہاں نوٹ کیجئے! ایک ہے تفرقِ دین۔ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ ۔انہوں نے اپنے دین کو پھاڑ دیا۔۔۔۔ دین کو پھاڑنا کیا ہوگا! ۔ نظامِ اطاعت کو تقسیم کردینا۔ایک حصّہ میں اللہ کی اطاعت ہورہی ہے اور دوسرے حصّوں میں اطاعت ہورہی ہے کسی اور کی ۔ کہیں اطاعت ہورہی ہے شریعتِ الٰہی کی اور کہیں اپنے نفس کی خواہشات کی۔کہیں زمانے کے چلن اور فیشن کی۔کہیں برادری کے رواج کی۔یہ دین ہی پھاڑ دیا گیا ہے ۔ یہاں فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ نہایت قابلِ غور حصّہ ہے ۔فَرَّقَ، یُفَرِّقُ تَفْرِیْقًا آتا ہے پھاڑ دینے، کاٹ دینے، ٹکڑے ٹکڑے کردینے اور جدا جدا کردینے کے لئے۔ دوسرا ہے تَفَرُّق فِی الدِّیْن ۔خود دین کے معاملے میں متفرق ہوجائیں۔ دین کے معاملہ میں متفرق ہونے کا تعلق ہے اقامتِ دین سے۔مسلمان فرقوں میں منقسم ہوجائیں تو پھر دین کیسے قائم ہوگا۔! دین کو قائم کرنے کے لئے تو بڑی مضبوط جدوجہد کی ضرورت ہے۔بڑی مجتمع قوتوں کی ضرورت ہے۔ مل جل کر کام کرنا اور زور لگانا ہوگا۔آپ تصور کیجئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جاں نثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی محنت، جدوجہد اور ایثار و قربانی کا جس کے نتیجے میں جزیرہ نمائے عرب میں اللہ کا دین بالفعل قائم اور نافذ ہوا جس کی مدح قرآن مجید جگہ جگہ کرتا ہے۔سورہ فتح میں فرمایا: هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۝ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ "وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو بھیجا ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ اس کو پورے جنسِ دین (نظامِ اطاعت و نظامِ حیات) پر غالب کردیں۔ اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر نہایت سخت اور آپس میں نہایت رحیم ہیں" یہ شان نہ ہوتی تو دین قائم نہ ہوتا۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم ۔۔۔ رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اقامتِ دین فرض ہے

فرمایا: اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ۔ دین کو قائم کرو۔اس معاملہ میں تفرقہ نہ ڈالو تم سب کا مقصود و مطلوب ایک ہو۔تم سب کے سامنے یہی ہو کہ سب سے پہلے تو خود اللہ کا بندہ بننا ہے۔یہ ہے انفرادی سطح پر توحیدِ عملی۔یہ توحید ہوگی اطاعت کو اللہ کے لئے خالص کرتے ہوئے۔پھر یہ کہ اجتماعی جدوجہد کا آغاز ہوگا دعوت الی اللہ سے اور اس کا منتہا اور مقصود ہوگا کہ پورے نظامِ اجتماعی پر، ملک پر،

پوری قومی زندگی پر اللہ کے دین کو قائم و نافذ کرنا ہے ۔ یہ ہے اقامتِ دین ۔ جو مرکزی مضمون ہے سورہ شوریٰ کا ۔ اس ضمن میں ان شاء اللہ تعالیٰ کل ہمارا مطالعہ آگے بڑھے گا۔ آج میں نے مکی اور مدنی سورتوں کے بارے میں کچھ تمہیدی باتیں آپ کو بتائیں ۔ وہ بھی اس لئے کہ ان چار سورتوں (زمر، مؤمن ، حٰم السجدہ اور شوریٰ) کے درمیان جو ربط ہے میں اس کو سامنے لانا چاہتا کہ توحید عملی کے موضوع پر ان چار سورتوں کا گروپ بہت اہم ہے ۔ سورہ زمر میں انفرادی سطح پر توحیدِ عملی ـــ اسی کا باطنی پہلو توحید فی الدّعاء سورۂ مومن میں ـــ پھر انفرادی سطح سے اجتماعی سطح کی طرف بڑھیں گے تو دعوتِ توحید کا مرحلہ ہے ـــ یہ ہے سورہ حٰم السجدہ میں ۔ اور اجتماعی سطح پر توحیدِ عملی کا ہدف ہے اقامتِ دین جو بیان ہوا سورہ شوریٰ میں ـــ

اللہ تعالیٰ ہمیں اس فیصلہ کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنی توانائیاں ـــ اور اپنی قوتیں اس توحیدِ عملی پر مرتکز کریں اور انفرادی سطح سے اجتماعی نظام تک اس توحید کو برپا کرنے کے لئے اپنی کمر کس لیں ۔

ان شاء اللہ کل سے ہم درس کا باقاعدہ آغاز کریں گے ۔
اقول قولی ھٰذا استغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

آمین یا رب العالمین

توحید عملی

کا

فریضۂ اقامتِ دین

سے ربط و تعلق

پہلا درس: سورۃ الشوریٰ

(از آیات ۱۳ تا ۲۱)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ
وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ
لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ
اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ
بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ
اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ
بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۴﴾ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ
وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ
لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا

حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۖ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ﴿١٥﴾ وَالَّذِينَ
يُحَاجُّونَ فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتُجِيبَ لَهُ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ
رَبِّهِمْ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ﴿١٦﴾ اللَّهُ الَّذِي أَنْزَلَ
الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ ۗ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ ﴿١٧﴾
يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا ۖ وَالَّذِينَ آمَنُوا مُشْفِقُونَ
مِنْهَا وَيَعْلَمُونَ أَنَّهَا الْحَقُّ ۗ أَلَا إِنَّ الَّذِينَ يُمَارُونَ فِي السَّاعَةِ
لَفِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ﴿١٨﴾ اللَّهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَهُوَ
الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ﴿١٩﴾ مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ ۖ
وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ
نَصِيبٍ ﴿٢٠﴾ أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ
اللَّهُ ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۗ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ
عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٢١﴾

حضرات و خواتین! کل ہمارا زیادہ وقت بعض تمہیدی باتوں کے بیان پر صرف ہوا۔ جن میں یہ امور شامل تھے کہ مکیات و مدنیات کس ترتیب سے مصحف میں آئی ہیں اور ان کے چھ بڑے بڑے گروپ کون سے ہیں! مکیات کے مشترک مضامین و موضوعات کیا ہیں! پھر ان گروپوں کے جو بنیادی و مرکزی مضامین ہیں۔ ان کے جو عمود ہیں ان میں کیا فرق ہے! ان میں باہمی نظم اور ربط و تعلق کیا ہے! پھر خاص طور پر چار سورتوں، سورہ زمر، سورہ مومن، سورہ حٰمٓ السجدہ اور سورہ شوریٰ میں وہ کون سا اہم مضمون ہے جو تدریجاً ترقی کرتا ہوا سورہ شوریٰ میں اپنے عروج کو پہنچا ہے ـــــ علاوہ ازیں میں نے سورہ شوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ کے ایک حصہ کی کچھ تشریح و توضیح بھی بیان کی تھی۔ اس ضمن میں اس افسوسناک صورت حال کا بھی ذکر کیا تھا جس سے ہم اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے فی الواقع دوچار ہیں۔

صحیح معنوں میں آج باقاعدہ درس کا آغاز ہو رہا ہے۔ آج ہم کوشش کریں گے کہ ان نو آیات کا مطالعہ مکمل کریں جن کی میں نے آغاز میں تلاوت کی ہے۔ ارادہ ہمارا ہے لیکن اس کے پورے ہونے

کا اللہ تعالیٰ کی توفیق پر دارو مدار ہے۔ مصحف میں آپ دیکھیں گے کہ ان نو آیات میں سے تین آیات حجم کے اعتبار سے نسبتاً بڑی بھی ہیں اور جب مطالعہ شروع ہو گا تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ مضامین کے اعتبار سے بھی ان تین آیات کی بڑی اہمیت ہے۔ بلکہ جیسا کہ میں نے کل عرض کیا تھا کہ اقامتِ دین کے موضوع پر یہ قرآن مجید کا ذروۂ سنام (CLIMAX) یعنی چوٹی ہے۔ اب ہم اللہ کے نام سے درس کا آغاز کرتے ہیں۔ جن حضرات کے سامنے مصحف موجود ہیں وہ متن پر اپنی نگاہوں اور ذہنوں کو مرتکز فرمائیں چونکہ اتنے بڑے مجمع میں ہر شخص کے سامنے مصحف ہونا ممکن نہیں ہے لہٰذا زیرِ درس حصّہ کی فوٹو سٹیٹ جملہ حاضرین میں تقسیم کرادی گئی ہے تاکہ (TEXT) ان کے سامنے بھی رہے۔ اس لئے کہ درس اس کے بغیر نہیں ہوتا۔ تقریر اور وعظ ہو سکتا ہے ۔۔۔ درس کے لئے متن کا سامنے ہونا ضروری ہے تاکہ قرآن مجید کے الفاظِ مبارکہ، جو درحقیقت کلام اللہ ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ ہمارا ذہنی تعلق قائم ہوتا چلا جائے۔ اسلئے کہ کسی شے کو ذہن میں مستحضر اور یاد رکھنے کے لئے الفاظ کے ساتھ ۔۔۔ (MENTAL ASSOCIATION) بنیاد بنتی ہے۔

آغاز ہوتا ہے: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ سے۔ میں کل یہ عرض کر چکا ہوں کہ "لَكُمْ" میں خطاب کی جو ضمیر ہے یعنی کن سے بات کی جارہی ہے! مخاطب کون ہیں! تو خطاب ہے امتِ محمد علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام سے۔ میں نے کل اس بات کی بھی وضاحت کر دی تھی کہ پوری نوعِ انسانی امتِ محمد ہے صلّی اللہ علیہ وسلّم۔ فرق یہ ہے کہ جو لوگ آپؐ کی تصدیق کرتے ہیں آپ پر ایمان رکھتے ہیں آپ کو اللہ کا آخری نبی و رسول مانتے ہیں۔ خود کو آپؐ کی ذاتِ اقدس سے منسوب کرتے ہیں وہ امتِ اجابت ہیں اور باقی تمام انسان امتِ دعوت ہیں۔ نبی اکرمؐ کی بعثت ہوئی ہے پوری نوعِ انسانی کے لئے۔ حضورؐ کی بعثت سے لے کر تا قیامِ قیامت جتنے بھی انسان اس دنیا میں آئیں گے وہ سب آپؐ کی امتِ دعوت میں شامل ہیں۔ لہٰذا فرمایا: شَرَعَ لَكُمْ: اب میں بغرضِ تفہیم اس کی ترجمانی یوں کروں گا کہ "اے امتِ محمد! علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام"۔ مِّنَ الدِّيْنِ: تمہارے لئے دین میں سے یا از قسمِ دین یا از جنسِ دین یا دین کے ضمن میں۔ یہاں آگے بڑھنے سے قبل لفظ شَرَعَ کے معنی سمجھ لیجئے! "شَرَعَ" کے معنی ہیں "کسی چیز کو مقرر کر دینا"۔ ہمارے یہاں عام طور پر استعمال ہوتا ہے "یہ شارعِ عام نہیں ہے"۔ یا سڑکوں کے نام 'شارع' کے ساتھ لکھے جانے لگے ہیں۔ جیسے 'شارعِ فیصل' چونکہ یہ نام راستہ اور سڑک چلنے کے لئے مقرر کیا جاتا ہے۔ اس لئے شارع کہلاتا ہے۔ تو کسی چیز کا تعین اور مقرر ہو جانا لفظِ شَرَعَ کا اصل مفہوم ہے۔

اب میں متن، ترجمہ اور مختصر تشریح ساتھ ساتھ بیان کرتا چلا جاؤں گا۔ فرمایا شَرَعَ لَكُمْ

مِنَ الدِّيْنِ ' مقرر کیا تمہارے لئے دین میں سے ' مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ ' وہی کچھ جس کی وصیت کی تھی (اللہ نے) نوح (علیہ السلام) کو اور جس کی وحی کی ہم نے (اے محمدؐ) آپؐ کی طرف ' یہاں خطاب میں واحد کا صیغہ آ گیا۔ اِلَیْكَ ' مراد ہیں شخصاً جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم - وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى وَعِیْسٰٓى۔ ' اور جس کی ہم نے وصیت کی تھی ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو ' علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام ــــ کل میں نے عرض کیا تھا کہ جن پانچ رسولوں کا ذکر یہاں آیا ہے اکثر محققین کے نزدیک یہی پانچ رسول اولو العزم من الرسل ہیں۔ ان میں اوّلین ہیں حضرت نوح علیہ السلام اور آخری ہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ درمیان میں حضرت ابراہیم پھر حضرت موسیٰ پھر حضرت عیسیٰ علیہم السلام۔ یہاں پہلے اوّل وآخر کا ذکر آ گیا پھر زمانی ترتیب کے ساتھ تین رسولوں کا۔ اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ' کہ قائم کرو دین کو یا قائم رکھو دین کو ' یہ دونوں ترجمے ہوں گے۔ دین قائم ہو تو اسے قائم رکھو۔ قائم نہ ہو تو اس کو قائم کرو۔

اقامتِ دین کا حکم

اَقِیْمُوْا کا لفظ اَقَامَ ' یُقِیْمُ ' اِقَامَةً (مصدر) سے فعل امر جمع مذکر مخاطب ہے باب افعال سے معنی ہوں گے کسی چیز کو کھڑا کرنا یا کھڑا رکھنا۔ تفہیم کے لئے اگر خیمہ پر قیاس کریں تو اگر خیمہ کھڑا ہے تو کھڑا رکھا جائے گا اور اگر گر گیا ہے تو اسے کھڑا کیا جائے گا ــــ کھڑا ہے اور آندھی آ رہی ہے طوفان آ رہا ہے۔ تو اسے کھڑا رکھنے کا اہتمام ہو گا۔ کھونٹے مضبوط ہوں رسّوں کو بعض اوقات مضبوطی سے تھام کر رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں خیمہ نہ گر جائے۔ پس خیمہ کھڑا ہے تو اسے کھڑا رکھو۔ اور اگر گر گیا ہے تو کھڑا کرو۔ تو یہ دونوں مفہوم اَقِیْمُوْا کے فعل امر میں شامل ہیں یہ دونوں مفہوم اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ تراجم میں اگر یہ لفظی فرق آپ کو نظر آئے تو اس کی وجہ سے پریشان نہ ہو جائیں کہ ترجمہ کھڑا رکھو درست ہے یا کھڑا کرو درست ہے ــــ دونوں ترجمے درست ہیں ــ دونوں مفاہیم اَقِیْمُوا الدِّیْنَ میں موجود ہیں۔ دین کو قائم رکھو یا قائم کرو۔

قابلِ غور مقام

آیت کے اس حصہ کے آخر میں فرمایا: وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ' اور اس کے بارے میں کسی تفرقہ میں مبتلا نہ ہو جانا '' ــــ یہاں فِیْهِ کا لفظ بہت اہم ہے۔ اس کو اچھی طرح سمجھنا ہو گا۔ اس مقصد کے لئے لفظ دین کو ایک مرتبہ پھر اچھی طرح جان لیجئے کہ دین کس کو کہتے ہیں! پھر میں عرض کروں گا کہ دین میں تفرقہ

کے معانی کیا ہوں گے! کل میں نے دین اور تفرقہ کی تشریح میں کچھ عرض کیا تھا۔ لیکن چونکہ اس سورۂ مبارکہ کا یہ عمود اور مرکزی مضمون ہے لہٰذا ہمیں ایک بار پھر ان کو اچھی طرح سمجھنا اور ذہن نشین کرنا ضروری ہو گا۔

لفظِ دین کی مزید تشریح

عربی زبان میں دین کا لفظ بنا ہے دَانَ یَدِیْنُ سے۔ اس کے بنیادی معنی ہیں بدلہ اور جزا و سزا۔ جیسے سورۂ فاتحہ میں فرمایا: مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ 'بدلے یا جزا و سزا کے دن کا مالک'۔ سورۂ ماعون میں فرمایا: اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ 'کیا تم نے دیکھا اس شخص کو جو (آخرت کے) بدلہ اور جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے'۔ سورۂ انفطار میں فرمایا: كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ۔ 'ہرگز نہیں بلکہ (تمہارے اعراض کی اصل وجہ یہ ہے کہ) تم بدلہ اور جزا و سزا (کے دن) کو جھٹلاتے ہو'۔ قرآن مجید کی ان تین آیات کے حوالے سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ ان میں 'دین' کے معنی بدلہ اور جزا و سزا کے ہیں۔ یہ اس لفظ کا بنیادی مفہوم ہے۔ اسی معنی میں لفظِ 'دَیْن' آتا ہے۔ جس کے معنی قرض کے ہیں۔ آپ کسی کو کوئی چیز ہبہ کر دیں تو وہ واپس نہیں لی جاتی۔ وہ ہدیہ ہے۔ عطیہ ہے۔ دَین کیا ہوتا ہے! آپ نے کسی کو قرض دیا۔ اب اسے آپ نے واپس لینا ہے۔ دَین اور دِین میں حروف کا فرق نہیں ہے۔ دونوں میں د، ی، ن استعمال ہوتے ہیں۔ فرق پہلے حرف د پر زبر اور زیر کا ہے۔ حروف اصلی ایک ہی ہیں۔ ہبہ، ہدیہ، عطیہ۔ آپ اسے جو بھی کہیں وہ واپس نہیں ملتا جبکہ اس کے بالمقابل دَین واپس ملتا ہے۔ لہٰذا جزا و سزا عمل کا واپس آنا ہے۔ نیک عمل کا بدلہ جزاء کی صورت میں ملے گا۔ یہ اس عمل کا (RE-BOUND) یعنی اس کا واپس آجانا ہے۔ بدی کی ہے تو سزا کی شکل میں بدلہ ملے گا۔ یہ بھی اس برے عمل کا واپس آجانا ہے۔ پس دِین کے اندر بھی یہ بنیادی مفہوم موجود ہے۔ اس لفظ کا دوسرا بنیادی مفہوم ہے اطاعت۔ اس کا تعلق بھی بدلہ اور جزا و سزا سے قائم رہتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جزا و سزا کسی قانون کے تحت ہی دی جاتی ہے۔ جنگل کا قانون ہو تو دوسری بات ہے لیکن مہذب اور متمدن معاشرے میں جزا و سزا کسی قانون کو مستلزم ہے۔ قانون کے مطابق کام ہو رہا ہو تو جزا اور تحسین ملے۔ اگر اس کے خلاف کام ہو رہا ہو تو سزا اور تعزیر ملے پھر اس کے ساتھ کسی ایسی ہستی کا تصور لازماً ہو گا جو قانون دینے والی ہو جس کی اطاعت کی جائے

---

[1] مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ اور مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ کے محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کے خطاب میں جو حوالہ جات آئے تھے ان میں "لفظ دین" اطاعت ہی کے معنوں میں آیا ہے۔ (مرتب)

تو جزا ملے اور اس کی نافرمانی کیجائے تو سزا ملے ــــ لفظ دین کے یہ بنیادی مفاہیم ہیں۔ ایک شاعر کا ایک مصرع ہے۔ دِنّاھُمْ کَمَا دَانُوْا "جیسا انہوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا اس کا ہم نے بھرپور بدلہ لے لیا"۔ عربی کا ایک مقولہ ہے: کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ اس کے معنی بالکل وہی ہیں جو اردو کے اس محاورے کے ہیں "جیسا کروگے ویسا بھروگے" ہندی میں اسے 'کرنی کا پھل' کہا جاتا ہے ــــ ان بنیادی مفاہیم کی توضیحات سے یہ بات ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ "دین" کے اساسی معنی ہوئے 'بدلہ' یعنی جزا و سزا کی شکل میں کسی قانون اور ضابطہ کے تحت اور کوئی ہستی جو قانون دینے والی ہو جس کی اطاعت ہو تو جزا ملے نافرمانی ہو تو سزا ملے۔

قرآنی اصطلاحات یہ بات تو ہم سب کو معلوم ہے کہ عربی زبان تو نزولِ قرآن حکیم سے پہلے موجود تھی۔ اسی عربیٔ مبین میں قرآن نازل ہوا۔ پس عربی ہی کے الفاظ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز کے لئے چن لیا اور معتدبہ الفاظ کے مفاہیم و معانی میں وسعت دے کر اصطلاحات کی شکل عطا فرمادی۔ جیسے لفظ صلوٰۃ پہلے بھی تھا۔ زکوٰۃ پہلے بھی تھا۔ صوم پہلے بھی تھا۔ لیکن جب ان الفاظ نے قرآنی اصطلاحات کی شکل اختیار کی تو اب ان الفاظ کو جب اصطلاحاً بولا جائے گا تو اس کے معنی و مفہوم وہی پیشِ نظر رہیں گے جو قرآن مجید میں اصطلاحات کی صورت میں ان میں شامل کئے گئے ہیں۔ اسی طرح لفظ "دِین" کو قرآن مجید نے اپنی ایک اہم اصطلاح بنایا۔ اب یہ اصطلاح کیا بنی؟ وہ یہ کہ:

"وہ کسی ہستی کو مطاعِ مطلق مان کر اس کی کامل اطاعت کے اصول پہ جو نظام زندگی بنے گا وہ اس ہستی کا دین قرار پائے گا"

غور سے سماعت فرمایئے کہ جہاں بھی کوئی نظام ہوگا وہاں پہلے یہ طے ہوگا کہ کون ہے مطاعِ مطلق؟ اور مختارِ مطلق! کون ہے اصل قانون ساز! کون ہے حقیقی مقنن۔ یہ طے ہو جانے کے بعد اس کی اطاعت کے اصول پر پورا نظام بنے گا اور قوانین مدوّن ہوں گے۔ اس کے جو احکام ہوں گے ان ہی کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کے معاملات چلائے جائیں گے۔ اس طرح جو نظام بنے گا وہ اس ہستی کا دین ہوگا۔ اگرچہ کل بھی لفظِ دین پر بحث ہوئی تھی تاہم آج پھر مضمون کی اہمیت کے پیشِ نظر اعادہ کر رہا ہوں

دین الملک کل کی تقریر میں اجمالاً میں اس کو بیان کر چکا ہوں ــــ بادشاہی نظام کیا ہے! بادشاہ (SOVEREIGN) ہے۔ حاکمیت اس کی ہے اس کی زبان سے نکلا ہوا لفظ قانون ہے۔ لہٰذا اس اصول پہ جو نظام بنے گا اسے کہیں گے دین ملک۔

بادشاہ کا نظام ۔ یہ لفظ قرآن مجید میں اس موقع پر سورۂ یوسف میں آیا ہے ، جب حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائی بن یامین کو روکنا چاہتے تھے لیکن وہاں بادشاہی قانون نافذ و رائج تھا ـــــ حضرت یوسفؑ مصر کے بادشاہ نہیں تھے ۔ بعض لوگوں کو مغالطہ ہو گیا ہے ۔ بلکہ اس حکومت میں بہت بڑے عہدے پر تھے ۔ وزیر خوراک کہہ لیں ، وزیر خزانہ کہہ لیں ۔ خود حضرت یوسفؑ نے بادشاہ سے کہا تھا کہ : قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ○ ۵۵ یوسف نے کہا ملک کے خزانے میرے سپرد کر دو ، میں انتظام کروں گا ۔ بندوبست کروں گا (اس قحط کے حالات کا جو بادشاہ وقت کو ایک خواب کی صورت میں دکھایا گیا تھا جس کی صحیح تعبیر حضرت یوسفؑ نے کی تھی) میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں " تو معلوم ہوا کہ حضرت یوسفؑ ایک بہت بڑے عہدیدار تھے ۔ چیف سیکرٹری کہہ لیجئے لیکن بادشاہ تو نہیں تھے ۔ بادشاہ وقت کے خواب کی تعبیر بتا کر تو آپؑ جیل خانے سے رہا ہوئے تھے ۔ چونکہ وہاں شاہی نظام تھا ۔ لہٰذا اسکی رو سے بلا کسی سبب کے کسی باہر کے شخص ، کسی غیر ملکی (FOREIGNER) کو روکنا ممکن نہیں تھا ۔ لہٰذا ایک خاص شکل اللہ تبارک و تعالیٰ نے پیدا فرمائی ۔ چنانچہ فرمایا :

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ۭ مَا	" اس طرح ہم نے یوسف کے لئے تدبیر فرمائی
كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ	(ان کے لئے اپنے بھائی کو روکنے کے لئے
الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ ۭ	ایک سبب پیدا فرما دیا) اُس (یوسف)
(سورہ یوسف جز آیت ۷۶)	کے لئے بادشاہ کے دین (یعنی مصر کے شاہی

قانون) کے تحت اپنے بھائی کو پکڑنا ممکن نہ تھا ۔ اِلّا یہ کہ اللہ ہی نے ایسا چاہا "

قرآن کے حوالے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ بادشاہی نظام کو بھی قرآن " دین " کہتا ہے اور یہ کہلاتا ہے " دین الملک "

دینِ جمہوریت موجودہ دور میں جمہوریت کی جس نیلم پری کی دنیا دیوانی ہے ، کل کی تقریر میں اس پر میں مفصل اظہار خیال کر چکا ہوں ۔ آج پھر اس کا اعادہ کر رہا ہوں ۔ دیکھئے دین الملک اور دین اللہ تو قرآنی اصطلاحات ہیں ۔ البتہ دینِ جمہور کی اصطلاح ہمیں قرآن و حدیث میں نہیں ملتی ۔ چونکہ اس وقت جمہوریت کا زمانہ نہیں تھا ۔ اس کا تصور موجود نہیں تھا لہٰذا کتاب و سنّت میں دین جمہور کی اصطلاح کیسے آتی ۔ ! اس لئے کہ جو چیز عوام کے ذہن اور ادراک میں ہے ہی نہیں ، جس کا چلن تو چلن تصور تک موجود نہیں ہے اس کو قرآن و حدیث میں لاکر لوگوں کے ذہن پر بوجھ نہیں ڈالا گیا ہے ۔ البتہ دو انتہائیں بیان فرما دیں ۔ دین الملک اور دین اللہ ۔ اب اس کے درمیان آپ

خود خانہ پُری کریں۔ "این قدر گفتیم باقی فکر کن" کے مصداق آپ خود (FILL UP THE BLANK) کریں۔ آپ کو اوّل و آخر بتا دیا گیا۔ درمیانی کام آپ خود کیجئے۔ نظام جمہوریت کے اصول و مبادی چونکہ وہی ہیں جو دین الملک اور دین اللہ کے ہیں تو ان پہ قیاس کرتے ہوئے کہا جائے گا کہ جمہوریت فی الواقع ایک دین ہے۔

ہوا یہ ہے کہ جب مذہب کو انسان کی زندگی کا محض ایک نجی معاملہ (PRIVATE AFFAIR) بنا دیا گیا اور ملوکیت کا دور قریباً ختم ہوا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ نظام کے لئے انسانی ذہن کوئی راہ تلاش کرے اور کوئی اصول وضع کرے۔ لہٰذا طے کیا گیا کہ ہر ملک کے رہنے والے اپنے ملک میں (SOVEREIGN) ہیں۔ حاکمیت جمہور کی یعنی عوام کی ہے۔ قانون سازی اور نظام کی ہیئت اس کے اصول و مبادی طے کرنے کا اختیار بالکلیہ عوام کو حاصل ہے۔ ان کے منتخب کردہ نمائندے پارلیمان یا اسمبلی میں کثرت رائے سے ہر نوع کا قانون بنانے کے مجاز و مختارِ کل ہیں۔ ان کے لئے کسی آسمانی شریعت و ہدایت اور کسی اخلاقی قدر کی پابندی کی ضرورت نہیں۔ ان کے نزدیک فیصلہ کن اور حتمی و قطعی بات اپنے عوام کی پسند و ناپسند ہے۔ عوام کا منتخب ایوان مجاز ہے کہ اکیاون فیصد اکثریت سے جو چاہے قانون بنائے وہ لواطت جیسے مکروہ فعل کو بھی جائز قرار دیدے، وہ چاہے تو طے کر دے کہ دو مرد بھی شوہر اور بیوی کی حیثیت سے رہ سکتے ہیں۔ ان کا یہ فعل قانونی طور پہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونا قرار پائے گا۔

یہ محض خیالی و نظری بات نہیں ہے۔ برطانیہ کی پارلیمنٹ یہ سب کچھ طے کر چکی ہے۔ اس کریہہ فعل کو وہاں قانونی تحفظ حاصل ہے۔ پارلیمان چاہے تو شارع عام پر، پارکوں میں، کلبوں میں، ڈراموں میں اسٹیج پہ جنسی فعل اور اختلاط کو جائز قرار دے دے جیسا کہ یورپ کے اکثر ممالک اور امریکہ کی اکثر ریاستوں میں اس فحاشی پر کوئی قدغن نہیں۔ بلکہ اس شیطانی فعل کو قانون کا تحفظ حاصل ہے ــــ وہ چاہے تو شراب نوشی، قمار بازی، سٹہ، لاٹری اور اسی قبیل کے منکرات کو تفریح یا ضرورت کا نام دے کر قانونی طور پہ جائز قرار دیدے۔ جیسا کہ دنیا کے اکثر ممالک میں عملاً یہ ہو رہا ہے۔ یہ ہے اصل جمہوریت جس میں جمہور کے نمائندوں کو قانون سازی کے لامحدود اختیارات حاصل ہیں۔ ان پہ کوئی تحدید (LIMITATION) نہیں ہے۔ چونکہ جمہوریت میں اصل حاکمیت (SOVEREIGNITY) عوام کی ہے لہٰذا اسمبلی ان عوام کی نمائندگی کرتی ہے ــــ اسلامی جمہوریہ کی بات چھوڑ دیجئے۔ اوّل تو فی الوقت صحیح معنوں میں یہ کہیں قائم ہی نہیں۔ اگر ہو گی تو ظاہر بات ہے کہ اس میں (LEGISLATIVE ASSEMBLY) یا پارلیمنٹ کو اس محدود دائرہ میں قانون سازی کا اختیار حاصل ہو گا جو اللہ اور اس کے رسول ؐ نے ان کے لئے چھوڑ رکھا ہے۔ اس میں بھی وہ شریعت کے کسی حکم سے نہ تجاوز کر سکتے ہیں نہ اعراض ــــ پارلیمنٹ کو لامحدود (UN-LIMITED) اختیارات کسی طور

پر حاصل نہیں ہوں گے۔

دینِ اللہ اب تیسرے مسئلہ کی طرف آئیے۔ جب اللہ کو مان لیا جائے کہ مطاعِ مطلق وہ تعالیٰ ہے ــــ حاکمیتِ مطلقہ اسی کی ہے۔ جب تسلیم کر لیا جائے کہ بادشاہِ حقیقی صرف وہ تعالیٰ ہے۔ قانون دینے کا اصل مجاز وہ تعالیٰ ہے۔ شارعِ حقیقی وہ تعالیٰ ہے۔ اس کے نمائندے کی حیثیت سے رسول ہیں۔ لیکن اصلاً حکومت اللہ کی ہے۔ مطلقاً اطاعت اسی کی ہے۔ اور یہ اطاعت بواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو گی۔ اس بات کو قرآن مجید میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ: مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ "جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔" یہاں الرّسول سے مراد ہیں جنابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ ایک جگہ فرمایا: وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ‌ؕ "اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ اذنِ الٰہی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔" اس آیت میں قاعدہ کلیہ کے طور پر یہ بات آگئی ہے کہ اللہ کی اطاعت کا واسطہ رسول ہی ہوا کرتے ہیں۔

قرآن حکیم میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلقہ کا مختلف اسالیب سے بیان ہوا ہے۔ وقت کی کمی کی وجہ سے میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں ان سب کا احصاء کر سکوں۔ لہٰذا چند آیات پیش کرتا ہوں، سورۂ یوسف میں ایک جگہ حضرت یوسف علیہ السّلام کی زبان سے کہلوایا گیا: اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ‌ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ‌ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ: "فرمان روائی اور حکم دینے کا اختیار اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی سیدھا طریقِ زندگی ہے۔" اسی سورۂ یوسف میں دوسرے مقام پر حضرت یعقوب علیہ السّلام کی زبان سے ادا کرایا گیا: اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ‌ؕ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ‌ۚ وَعَلَيۡهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُتَوَكِّلُوۡنَ ۝ "حاکمیت اللہ کے سوا کسی کی نہیں اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور جس کو (کسی پر) بھروسہ کرنا ہے تو اسے چاہیئے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کرے۔" سورۂ انعام میں ایک دوسرے انداز سے اس بات کا اظہار فرمایا گیا کہ آگاہ ہو جاؤ حقیقی حاکمیت اللہ ہی کی ہے اور وہ تعالیٰ (اپنی رعایا (انسان کا) حساب لینے میں بڑا تیز ہے۔" اَلَا لَهُ الۡحُكۡمُ وَهُوَ اَسۡرَعُ الۡحٰسِبِيۡنَ ۝ حاکمیت صرف اللہ ہی کی ہے۔ لَهُ الۡحُكۡمُ قرآن مجید میں متعدد بار آیا ہے۔ مزید برآں یہ مضمون مختلف اسالیب سے قرآن مجید میں بار بار آیا ہے کہ وَ لِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ۔ اور لَهُ الۡمُلۡكُ ــــ یہاں دونوں جگہ جو حرفِ جار لام آیا ہے یہ لامِ تملیک بھی ہے اور لامِ استحقاق بھی ــــ یعنی (DE-FACTO اور DE-JURE) اسی تعالیٰ کی بادشاہت ہے۔ اور یہ بادشاہت دنیا کے عام بادشاہوں کی طرح کی نہیں ہے بلکہ اس شان سے ہے کہ وہ ہر چیز پر کامل قدرت رکھتا ہے: تَبٰرَكَ الَّذِىۡ بِيَدِهِ الۡمُلۡكُ

[illegible]

[illegible]

[illegible] حمد صلی اللہ [illegible]

[illegible] تھے۔ آپ [illegible] کے لئے آمادہ تھے

[illegible]

اللہ تعالیٰ نے [illegible] دنیا میں انسان کو [illegible] آزادی دی ہے اور اسے اختیار دے دیا ہے کہ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا "چاہے شکر گزار بندہ بن کر رہے چاہے ناشکرا" [illegible] اپنی [illegible] سے اللہ [illegible] "فرمانبردار، اطاعت گزار بن کر رہے" اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر گوشے میں اسی کی ہدایت پر عمل پیرا ہو۔ یہ ہے لفظ دین کا حقیقی مفہوم اور مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْن کا اصل تقاضا۔ اس کو بھی طرح ذہن نشین کر لیجئے۔

ہر دین غالب ہونا چاہتا ہے

جب یہ بات واضح ہو گئی کہ "دین" اس نظام زندگی کو کہتے ہیں جس میں انفرادی سے لے کر اجتماعی زندگی تک کلی زندگی ایک [illegible] کی اطاعت کے تابع ہو تو ایک حقیقت اور سمجھ لیجئے وہ یہ کہ ہر دین "اپنی فطرت کے اعتبار سے یہ چاہتا ہے کہ وہ قائم ہو اور غالب ہو۔ بادشاہ کا دین قائم و نافذ ہو تو بادشاہ کا دین کہلائے گا۔ بادشاہ مغلوب ہو گیا تو پھر بادشاہ کا دین کہاں رہا! وہ تو ختم ہو گیا۔ جب تک بادشاہت قائم ہے اس وقت تک دین الملک ہے ورنہ نہیں ـــــ سورۂ زخرف میں دیکھئے جہاں فرعون کا قول نقل ہوا۔ اس نے اپنی قوم کو منادی کرائی: وَنَادَىٰ فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي "اور فرعون نے اپنی قوم میں منادی کرائی اور کہا" اے میری

قوم کے لوگو! کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے؟ اور کیا یہ سارا آب پاشی کا نظام میرے اختیار میں نہیں ہے؟" میں جس کو چاہوں پانی دوں جس کے لئے چاہوں پانی روک لوں۔ پھر سورۂ بقرہ میں اس محاجہ کو دیکھئے جو نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا تھا: اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَاۗجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ "(اے نبی) کیا آپ نے اس شخص (نمرود) کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیمؑ سے جھگڑا کیا تھا ان کے رب کے بارے میں اس بنا پر کہ اللہ نے اسے حکومت دے رکھی تھی۔" اس حکومت کی بنیاد پر اس کو زعم ہو گیا تھا کہ مختارِ مطلق اور علی الاطلاق حاکم و بادشاہ وہ ہے۔ وہ بھی خدائی کا مدعی تھا۔" جب حضرت ابراہیم نے اس سے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے۔" اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُـحْيٖ وَيُمِيْتُ۔ تو وہ سرکش بولا۔ "زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔" قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ۔ روایات میں آتا ہے کہ اس نے دو قیدی جیل سے بلوائے۔ ان میں سے ایک کو آزاد کیا کہ جاؤ تم بری ہو اور دوسرے کی دربار ہی میں گردن اڑوادی اور حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ دیکھو میں نے ایک کو زندہ رکھا اور ایک کو مروا دیا۔ تو میرے پاس زندگی و موت کا اختیار ہے کہ نہیں! حضرت ابراہیمؑ نے جب دیکھا کہ یہ تو کج بحثی پر آ گیا ہے تو انہوں نے آخری بات کہہ دی کہ "میرا رب تو وہ ہے جو سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا"۔ — قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ۔ اگر تجھے واقعی اختیار حاصل ہے تو یہ کر کے دکھا۔ اس بات پر وہ کافر مبہوت، حیران اور ششدر ہو کر رہ گیا۔ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ۔ وہ لاجواب ہو گیا، بغلیں جھانکنے لگا۔ جس طرح نمرود نے کہا تھا کہ زندگی اور موت میرے قبضہ میں ہے اسی طرح فرعون نے کہا تھا کہ آب پاشی کا نظام اور حکومت کا انصرام میرے ہاتھ میں ہے۔ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ — لہٰذا میرا حکم چلے گا۔ تو جب تک اس کا حکم چل رہا ہے تو ہے، یہ نہیں تو دین کہاں رہا! ختم ہو گیا۔ اسی طرح جب جمہور کو انتخاب کا حق حاصل ہے اور وہ اپنے نمائندوں پر مشتمل پارلیمان یا اسمبلی منتخب کرتے ہیں اور یہ منتخب پارلیمان جمہور کی حاکمیت کے اصول پر کاروبارِ حکومت چلاتی ہے تو جمہوریت بالفعل قائم ہے لیکن اگر کوئی فوجی سربراہ اپنے ساتھیوں کے تعاون سے اسمبلی یا پارلیمنٹ توڑ دے اور مارشل لاء نافذ کر کے بحیثیت چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر حکومت کا انتظام و انصرام اور جملہ اختیارات سنبھال لے تو جمہوریت کہاں رہی! دین الجمہور ختم ہو گیا۔ اس لئے کہ نظام تو وہی ہے جو بالفعل قائم ہو اور واقعتاً اس کے اختیارات کا سکہ چل رہا

ہو۔ بالکل اسی طرح دین اللہ قائم د نا نذ اسی وقت سمجھا جائے گا جب امرِ واقعی میں وہ نظام قائم ہو جس میں بالفعل اللہ ہی کو (SUPREME AUTHORITY) مانا گیا ہو۔ (SOVEREIGN) فی الحقیقت اللہ ہی کو تسلیم کیا گیا ہو۔ اسی کے احکام کے آگے سب کے سر جھکے ہوئے ہوں اور عملاً صورتِ حال یہ ہو کہ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۔ اللہ کا کلمہ سب سے اونچا ہو جائے۔ اللہ کی بات اس کا فرمان بالاترین ہو جائے۔ اور یہ ہو پورے نظام زندگی پر — جزوی نہیں۔ کل کا کل نظام اللہ تبارک و تعالیٰ کی اطاعت میں جکڑا ہوا ہو۔

کامل غلبہ درکار ہے

جیسے کل میں نے بتایا تھا کہ انفرادی توحید جزوی مطلوب نہیں ہوتی بلکہ کلی مطلوب ہوتی ہے۔ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۝ پس بندگی کرو اللہ کی، پرستش کرو اللہ کی اطاعت کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے اور آگاہ ہو جاؤ اللہ کے لئے تو دینِ خالص مطلوب ہے۔" اللہ اس بات کے لئے تیار نہیں ہے کہ آدھا دین میرا مان لو۔ کچھ اطاعت میری کر لو۔ آدھا دین کسی اور کا مان لو اس کی اطاعت بھی کر لو۔ یہ طرزِ عمل درکار نہیں ہے۔ اللہ کا مطالبہ تو یہ ہے کہ کُل کا کُل دین۔ کامل اطاعت اسی کے لئے خالص ہو جائے اور دین میں انسان پورا کا پورا داخل ہو جائے۔ اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۔ چنانچہ اس آیت کو نوٹ کیجئے جو سورۂ انفال کی آیت ہے کہ قتال کی آخری منزل کیا ہے؟ قتال وجہاد فی سبیل اللہ کا آخری ہدف کیا ہے! فرمایا: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ "(اے مسلمانو!) ان (کافروں اور مشرکوں) سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ و فساد بالکل فرو ہو جائے اور دین کُل کا کُل اللہ کے لئے ہو جائے۔"[1] یہ نہیں کہ اس کا کوئی جزو مان لیا جائے۔ مسجد میں تو اللہ کی مرضی چل رہی ہو، پارلیمنٹ میں نہ چلتی ہو۔ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس اور ماتحت عدالتوں میں نہ چلتی ہو۔ ذرائع ابلاغ میں نہ چلتی ہو بازار میں نہ چلتی ہو۔ منڈی میں نہ چلتی ہو۔ گھر میں نہ چلتی ہو۔ یہ تو معاذ اللہ تم نے اللہ کو ٹرخا دیا ہے۔ ایک بڑا ہی جزوی اور چھوٹا سا حصہ تو اس کو دیا ہے باقی سب دوسروں کو الاٹ کر دیا۔

---

[1] یہی وجہ تھی کہ مانعینِ زکوٰۃ سے خلیفہ اوّل حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قتال کیا تھا۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو زکوٰۃ کے منکر نہیں تھے البتہ مرکزی بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ (مرتب)

تفریق دین

یہ ہے درحقیقت تفریق دین۔ جس کے متعلق میں نے کل بھی کچھ عرض کیا تھا اور آج بھی شروع میں کہا تھا کہ ہمیں لفظِ دین کے ساتھ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ پر بھی گہرائی میں اتر کر غور کرنا ہو گا۔ خاص طور پر یہاں فِیْہِ قابلِ توجہ ہے۔ فَرَّقَ، یُفَرِّقُ تَفْرِیْقًا کے معنی ہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ علیحدہ علیحدہ کر دینا، پھاڑ دینا۔ دین ایک وحدت ہے۔ پورا نظامِ زندگی۔ انفرادی بھی اور اجتماعی بھی۔ ایک وحدت بن کر اللہ کے تابع آجائے تو یہ ہے دین اللہ۔ گویا کہ مکمل دین قائم ہو گیا۔ اگر یہ نہیں ہے اور حال یہ ہے کہ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ۔ دین کو پھاڑ دیا کچھ حصہ ہم نے لے لیا، کچھ آپ نے لے لیا۔ کچھ کسی اور کو دے دیا۔۔۔ دین کے ٹکڑے کر دیئے کہ کچھ حصے کو ہم مانیں گے کچھ کو نہیں مانیں گے۔ یہ ہے تفریق دین۔۔۔ کل میں یہ آیت آپ کو سنا چکا ہوں کہ: اَلَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ "(اے محمدؐ) جو لوگ اس دین کے ٹکڑے کر دیں اس کو پھاڑ دیں، اس کے حصے بخرے کر دیں اور خود تفرقے میں بٹ جائیں تو ایسے لوگوں سے آپؐ کا کوئی تعلق نہیں، ان سے آپؐ کو کوئی سروکار نہیں"۔ لرز جانا اور ڈرنا چاہیئے اس وعید سے کہ کس طور پر اللہ عزوجل ایسے لوگوں سے اعلانِ برأت فرما رہے ہیں جو اللہ کے اس دین میں جو تمام انبیاء و رسل کا دین ہے تفرقہ ڈالنے کی روش اختیار کریں کہ ان سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ فِیْہِ میں یہ مفہوم غالب ہے۔

تفریقِ دین کا دوسرا مفہوم

اس کا ایک مفہوم اور بھی ہے جس کو میں کل بھی بیان کر چکا ہوں۔ وہ یہ کہ اقامتِ دین کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے امت کو بنیانِ مرصوص بن جانا لازم ہے۔ فقہی مسائل میں رائے اور تعبیر کا اختلاف بالکل دوسری چیز ہے۔ یہ اختلاف صرف فقہ کے چار مشہور و معروف ائمہ کرام امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ یا سنی المسلک علماءِ کرام کے درمیان نہیں ہوا بلکہ صحابہ عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مابین بھی رہا ہے۔ یہ فقہی مسالک کے اختلافات اقامتِ دین کے فریضہ کی ادائیگی میں اگر روک بن جائیں۔ گروہ بندی ہونے لگے 'من دیگرم تو دیگری' والا معاملہ ہو جائے تو یہ وحدتِ ملی ہی کے لئے مہلک نہیں بلکہ اقامتِ دین کے فریضہ کی انجام دہی میں بھی رکاوٹ بن جائے گا۔ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ میں اس نوع کے تفرقے سے بچنے کا بھی نہی کے اسلوب میں حکم دیا گیا ہے۔ فریضۂ اقامتِ دین کی ادائیگی کے لئے پوری امت کی اجتماعی قوت درکار ہے۔ دین دنیا کے صرف ایک حصہ پر قائم کرنا تو مطلوب نہیں بلکہ پورے کرۂ ارض پر اللہ کا دین قائم کرنے کی جدوجہد کرنی ہے۔ پوری دنیا کو نورِ توحید سے منور کرنا ہے۔ گروہ بندی اور تفرقہ بازی کیوں ہوتی

ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کا ذکر اسی درس میں ایک آیت کی تصریح و توضیح میں آگے آئے گا۔

فقہی اختلافات حدود کے اندر ہوں تو تفرقہ نہیں

دین ایک ہو، اور وہ ہو دین توحید۔ اس کے تحت تفصیلی قوانین میں تھوڑا تھوڑا فرق ہو تو تعبیر (INTERPRETATION) کا فرق ہو، استنباط کا فرق ہو، اجتہاد کا فرق ہو لیکن توحید کا اصول سب کے نزدیک ایک ہی ہو تو جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا یہ تفرقہ نہیں ہے۔ ہمارے تمام فقہا اور سلفی المسلک ائمہ کے نزدیک اصول ایک ہی ہے کہ حکم دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہے اور اس کے نمائندے کی حیثیت اس تعالیٰ کے رسول کی ہے۔ اللہ اور رسول یہ ہیں اصل ستون جن پر دین قائم ہے
وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ
اس اصول کے تحت مختلف نئے مسائل میں استنباط کیا جا سکتا ہے۔ ہر مجتہد اور ہر فقیہہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے منشاء کے مطابق کسی نئے مسئلہ میں حکم تلاش کر سکتا ہے اور اس میں کچھ نہ کچھ فرق بھی واقع ہو سکتا ہے۔

موجودہ دور کی ایک مثال

آپ کو معلوم ہے کہ بھٹو صاحب کے خلاف قتل کا مقدمہ جب سپریم کورٹ میں آیا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ مقدمہ تو پاکستان کی تاریخ کا ایک حصہ بنے گا۔ اس کے باوجود کہ قانون ایک ہی ہے۔ نئی شہادتیں سپریم کورٹ میں پیش نہیں ہوئیں وہ تو ہائی کورٹ میں مقدمہ کی جو مثل تیار ہوئی تھی اور اس پر جو فیصلہ ہوا تھا اسی پر بحث و تمحیص اور جرح و تعدیل ہوئی — اس نوع کے مقدمات کے سابقہ فیصلوں اور نظائر سے استدلال و استشہاد ہوا — مختلف شہادتوں کے مابین تضادات کی نشاندہی کرنے کی کوشش ہوئی۔ مثل پر جو مختلف شہادتیں ریکارڈ ہوئی تھیں ان میں سے ہر شہادت میں تضاد تلاش کیا گیا۔ سابقہ فیصلے کے سقم بیان کئے گئے ہیں۔ ان تمام امور پر فریقین کے وکلاء نے بحث کی اور اپنے اپنے دلائل دیئے — اب دیکھئے قانون ایک، ساری مثل ایک، لیکن سپریم کورٹ کے جج صاحبان نے اختلاف کیا۔ اختلاف ہو سکتا ہے۔ جنہوں نے پھانسی کی سزا کا حکم دیا اور جنہوں نے بری کرنے کا فیصلہ دیا ان میں سے کسی نے اصول سے اختلاف نہیں کیا وہ سب قانون کو بھی تسلیم کر رہے ہیں لیکن شہادتوں سے استنباط و استدلال میں اختلاف کر رہے ہیں ——— پوری دنیا کو معلوم ہے۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ فیصلہ کرنے والوں نے بدنیتی سے مختلف فیصلے دیئے ہیں۔ اور تو اور صرف دو جج ایک قانون کے تحت ایک ہی مقدمہ کو سنتے ہیں تو ان کی آراء میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے۔

اصل الاصول پس اختلاف شئے دگر ہے لیکن جہاں اصول بدل جائیں گے، وہ تفرق فی الدین ہو جائے گا۔ البتہ جب اصول یہ ہو کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام واضح احکام یعنی نصوص قرآن وسنّت کی اطاعت اور تابعداری کی جائے گی۔ اور صرف اسی دائرے میں رہ کر جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے مقرر کر دیا ہے معاملات طے کئے جائیں گے۔ تو یہ تفرق نہیں ہوگا بلکہ دین اللہ ہوگا۔

دین ہمیشہ سے ایک رہا ہے دین ہمیشہ سے ایک ہی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ دین جو حضرت آدم علیہ السلام کا تھا وہی دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ یہ دین ہے دینِ توحید — اللہ کو احد مان لینا۔ اسے وحدہٗ لاشریک لہ جان لینا۔ جب اس توحید کو آپ عملاً انفرادی زندگی میں لے آئیں گے۔ چونکہ صرف زبانی اقرار کافی نہیں ہے — تو وہ ہوگی اللہ کی عبادت کرنا، اپنی کُل اطاعت کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے — اسی توحید کو جب آپ اجتماعی نظام کے ذیل میں لائیں گے تو یہ ہوگا پورے نظام زندگی کو اللہ کے حکم کے تابع کر دینا۔ یہ ہوگا اجتماعی طور پہ عملی توحید کا برپا کر دینا یا دین اللہ کو بالفعل قائم کر دینا۔ یہ ہے اقامت دین۔ بالالفاظِ مبارکہ اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ ہمارے ہاں جو فقہی اختلاف پائے جاتے ہیں۔ ان سب میں اصل الاصول توحید ہی ہے۔ مسلّماتِ دین سب کے نزدیک مشترک ہیں۔ سب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اطاعتِ مطلقہ کی سزاوار صرف ذات باری تعالیٰ ہے اور یہ اطاعت بواسطہ رسولؐ ہوگی۔ جناب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحیثیت رسول اللہ مطاع ہیں۔ آپؐ کے احکام آپؐ کے فیصلے، آپؐ کی سنّت، آپؐ کے فرمودات واجب اطاعت اور واجب اتباع ہیں بفحوائے آیاتِ قرآنیہ: مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ "جس نے بھی (محمدؐ) رسول اللہ کی اطاعت کی پس اس نے اللہ کی اطاعت کی" اور وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؕ "کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملہ کا فیصلہ کر دے تو پھر اُسے اپنے معاملہ میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔ سورۃ نساء میں فرمایا: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ

فِیْ مَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ۔ (اے محمدؐ) آپؐ کے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے باہمی اختلافات میں آپؐ ہی کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں: علاوہ ازیں اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کا حکم قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اللہ کی اطاعت اور اس کے رسولؐ کی اطاعت دین کے دو ستون ہیں۔ جن پہ دینِ توحید قائم ہے لہٰذا تمام فقہاء اور ائمہ دین رحمۃ اللہ علیہم کا دین یہی دین توحید ہے۔ وہ چاہے امام ابو حنیفہؒ ہوں امام مالکؒ ہوں امام شافعیؒ ہوں، امام احمد بن حنبلؒ ہوں۔ امام بخاری ہوں وغیرہم۔ کتاب وسنت سے استدلال کرتے ہوئے جو تفاصیل طے کی جائیں گی تو بعض مسائل کے استنباط، تعبیر اور بعض میں اجتہاد وقیاس، راجح ومرجوح، افضل ومفضول کی آراء میں اختلاف ہو سکتا ہے اور ہوا ہے۔ ان ائمہ عظام کے مابین معاذ اللہ دین کے معاملہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے یہ فقہی مذاہب اور مسالک ہیں۔ سب کا دین، دینِ اسلام ہے۔ مسلکوں کے اختلافات میں کوئی حرج نہیں۔ سب حق ہیں۔ دین میں تفرقہ درست نہیں ہے یہ تو کفر ہو جائے گا۔ اس بات کو اس طرح بھی سمجھ لیجئے اور فرض کیجئے کہ کسی ملک میں غالب اکثریت امام مالکؒ کے مسلک پر چلنے والوں کی ہے تو جب وہ اپنے ملک میں اللہ کا دین قائم کریں گے تو وہاں مالکی فقہ رائج ہو جائیگی کسی جگہ پر احناف کی عظیم اکثریت ہے تو وہ جب اپنے یہاں اللہ کا دین قائم کریں گے تو وہاں فقہ حنفی نافذ ہوگی۔ وقس علیٰ ذالک: لیکن فقہ کے اختلافات کے باوصف سب کا دین ایک ہی ہوگا اور وہ ہوگا دینِ اسلام، دین توحید ــــ اس بات کو آج اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ دین اور شریعت یا دین اور فقہ میں کیا فرق ہے! یہاں بات دین کی ہو رہی ہے۔ شریعت کی نہیں۔ دین کے معاملہ میں متفرق نہ ہو۔ اس پر جمے رہو۔ اللہ ہی کو مطاعِ مطلق ماننا ہے۔ اسی کی حاکمیت تسلیم کرنی ہے۔ اسی کی تابعداری اور فرمانبرداری کرنی ہے۔ اسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔ اسی کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت پر مبنی اپنا نظامِ حیات بنانا ہے۔ یہ ہے اقامتِ دین۔ اس کے بارے میں تفرقے میں نہ پڑ جانا۔

دینُ اللہ کا قیام مُشرکین پر بھاری ہوتا ہے

اس آیت مبارکہ میں آگے جو مضمون آرہا ہے اس کی تفہیم کے لئے مجھے تمہیداً کچھ باتیں عرض کرنی ہوں گی۔

نزولِ قرآن کا پس منظر اور تاویلِ خاص

دیکھئے قرآن مجید چونکہ ایک خاص دور میں نازل ہوا ۶۱۰ عیسوی سے لے کر ۶۳۲ عیسوی تک جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید کے نزول کا زمانہ ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک خاص ملک یعنی عرب میں پورا کا پورا قرآن نازل ہوا۔ تیسرے یہ کہ قرآن مجید کے اوّلین مخاطب محمد رسول اللہ پھر آنحضور کے توسط سے اوّلین مخاطب وہی لوگ تھے جو عرب میں آباد تھے۔ لہٰذا قرآن حکیم کی ایک تفسیر اس انداز میں ہم کریں گے کہ جب فلاں آیت یا فلاں سورت نازل ہوئی تو اس خاص پس منظر (IMMEDIATE SPECTACLE) میں اس کا کیا مفہوم سمجھا گیا ! یہ ہوگی قرآن مجید کی تاویلِ خاص ـــــ ہمیں اس آیت یا آیات یا سورت کو اس خاص پس منظر میں رکھ کر غور کرنا ہوگا کہ یہ کب نازل ہوئی! کس مرحلہ پر نازل ہوئی ! اس وقت اس کا مفہوم کیا سامنے آیا۔! اس پر کیا عمل ہوا۔! یہ ہوگی تاویل خاص ۔

تاویلِ عام

لیکن ۔ یہ لیکن بہت اہم ہے اس کو غور سے سنیئے ! لیکن قرآن حکیم صرف اس دور کے لئے نازل نہیں ہوا۔ ابدالآباد تک کے لئے یہ قرآن ہدایت و رہنمائی ہے۔ صرف عربوں کے لئے نہیں پوری نوعِ انسانی کے لئے ہے۔ ھُدًی لِّلنَّاس ہے ـــــ لہٰذا دوسری تاویل ہوگی تاویل عام ـــــ جس کے لئے مفسّرین کا اصول یہ ہے کہ الاعتبار لعموم اللفظ لا لخصوصِ السبب ۔ خاص حالات جن میں آیتیں یا سورتیں نازل ہوئیں ان کو سامنے رکھ کر نہیں بلکہ الفاظ کو دیکھ کر ان کے عموم سے جو مطلب اخذ کیا جائے گا وہ قرآن مجید کا ابدی مفہوم و مطلب ہوگا۔ لیکن اس تاویلِ عام کے لئے ضروری ہے کہ تاویل خاص کو انسان سمجھ لے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عام تاویل میں قرآن کے منشاء سے بہت دور چلا جائے ۔ اس کا امکان ہے اور غالب امکان ہے۔ لہٰذا پہلے تاویل خاص کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ پھر یہ کہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اس سے جو عام اصول نکل رہے ہوں یا استنباط کئے جاسکتے ہوں تو ان کو پلّے باندھ لینا چاہیئے کہ یہ ہے قرآن مجید کی ابدی رہنمائی ـــــ یہ ربط و تعلق ہے تاویل خاص اور تاویلِ عام کا ۔

اب آپ تاویل خاص کے اعتبار سے اس پس منظر کو دیکھئے کہ جب یہ آیت نازل ہو رہی ہے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مخاطبو! جن تک حضور دعوتِ توحید پہنچا رہے ہیں ۔ یا اے محمدؐ کے نام لیواؤ ! جنہوں نے اس دعوتِ توحید پر لبیک کہا ہے، اسے قبول کر لیا ہے" تمہارے لئے ہم نے وہی دین مقرر کیا ہے جو حضرت نوح کو دیا۔ حضرت ابراہیم، حضرت موسٰی، حضرت عیسٰی کو دیا

(علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام) اور جو اب ہم نے وحی کیا ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب
تمہارا فرض کیا ہے ؟ "یہ کہ اس دین کو قائم کرو اور اس کے بارے میں تفرقہ میں نہ پڑو" ۔۔۔ ا
سمجھئے کہ کون کون لوگ اس وقت عرب میں تھے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین تھے

اوّلین مخاطب مشرکینِ عرب

سب سے پہلے مخاطب تو مشرکینِ عرب تھے جو ہدایت سے بہت دور جا چکے تھے۔ ان کے پاس کوئی آسمانی (
یا کوئی آسمانی کتاب موجود نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر و بیشتر عرب حضرت اسمٰعیل کی اولاد ہیں
یہ عرب مستعربہ کہلاتے ہیں۔ ان میں کچھ عربِ عاربہ ہیں، اصل عرب کے پرانے رہنے والے
اس لئے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تو اصل عرب کے رہنے والے نہیں تھے۔ وہ تو حضرت ابراہیم
علیہ السلام کے بڑے بیٹے ہیں جن کا اصل وطن تو عراق تھا۔ جنہوں نے حضرت اسمٰعیلؑ کو عرب
آباد کیا تھا۔ بفحوائے آیتِ قرآنی: رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْ
عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ۔ لہٰذا حضرت اسمٰعیلؑ خود اور ان کی ذر
عرب مستعربہ کہلاتی ہے۔ یعنی عرب بن گئے ہیں اصل عرب نہیں ہیں۔ یمن وغیرہ سے جو قبائل نکلے
اصل عرب ہیں۔ مدینہ میں اوس و خزرج کے دونوں قبیلے اصلاً یمنی تھے۔ جو وہاں آکر آباد ہوئے
ان کا تعلق عربِ عاربہ سے تھا۔ ایک تو یہ قبائل ہیں لیکن ان پر اور عرب کے تمام قدیم قبائل پر حضرت
ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کا اتنا اثر ہوا کہ ان سب لوگوں نے اپنے آپ کو دینِ ابراہیمی پر
ہی قرار دے دیا۔ حضرت ابراہیمؑ کا ایک لقب حنیف بھی ہے۔ قرآن میں بھی آں جنابؑ کے ساتھ
یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا تمام عرب خود کو ملّتِ حنیفی پر عمل پیرا قرار دیتے تھے اور بنی اسمٰعیل
کہلاتے تھے۔ پھر چونکہ حضرت ابراہیم کی نسل میں حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد نبی کوئی نہیں آیا اور
وقفہ کتنا ہے ؟ آپ کو اندازہ ہونا چاہیئے ۔۔۔۔ قریباً ڈھائی ہزار برس۔ اس عرصہ کے دوران
کوئی نبی نہیں، کوئی رسول نہیں، کوئی کتاب نہیں ۔۔۔۔ نبی آئے، رسول آئے، کتابیں نازل ہوئیں
ہدایتِ الٰہی کا سلسلہ جاری رہا لیکن دوسری نسل میں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے
بیٹے حضرت اسحٰق علیہ السلام سے چلی اور جو فلسطین کے علاقے میں آباد ہوئی۔ حضرت اسحٰق بھی نبی ہیں، انکے
بعد ان کے بیٹے حضرت یعقوب نبی ہیں۔ ان کے بارہ بیٹوں میں سے حضرت یوسف نبی ہیں علیہم السلام
چونکہ حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل تھا لہٰذا اب یہ بنی اسرائیل کہلائے۔ اب نبوت و رسالت
کا سلسلہ اس نسل میں چلتا رہا۔ ان ہی میں حضرت موسیٰ ہیں۔ حضرت داؤد ہیں، حضرت سلیمان ہیں،

علیہم السلام۔ ان ہی میں سے حضرت عُزیر ہیں، حضرت زکریا ہیں، حضرت یحییٰ ہیں اور بے شمار نبیوں کا سلسلہ ہے جن کا ذکر تورات میں ہے۔ علیٰ نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام۔ اور اس سلسلہ کے آخری نبی و رسول ہیں حضرت عیسیٰ جن کو روح اللہ بھی کہا جاتا ہے۔

بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے موقع پر عرب میں عربوں کے یہ دو گروہ عرب مستعربہ اور عرب عاربہ موجود تھے۔ جو اپنے آپ کو حضرت اسمٰعیل کی طرف منسوب کرتے تھے۔ وہ دین اور توحید سے بہت دور جا چکے تھے۔ کہنے کو وہ کہتے تھے کہ ہم حضرت ابراہیمؑ کے پیروکار ہیں لیکن بدترین شرک میں مبتلا تھے۔ بت پرستی، ستارہ پرستی ان کے یہاں ہو رہی تھی، فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا ہوا ہے۔ توحید کی کوئی رمق ان میں باقی نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ حج کے جو مناسک ان کے یہاں چھوڑ گئے تھے ان میں بھی ردّ و بدل کر لیا تھا۔ مادرزاد برہنہ ہو کر طواف کرنے کو بڑی نیکی کا کام سمجھ رہے تھے۔ نہ معلوم ان کے یہاں اور کیا کیا خرافات آ گئی تھیں۔ عربوں کے یہ دو گروہ ہیں جن کو قرآن مجید کہتا ہے **اُمّیین** اور **مشرکین**۔

دوسرے مخاطبین: اہلِ کتاب

دوسرا گروہ جو مخاطب تھا وہ نسل حضرت ابراہیمؑ کے دوسرے بیٹے حضرت اسحٰقؑ سے چلی تھی جن کے بیٹے حضرت یعقوبؑ جن کا لقب اسرائیل تھا، سے اس کا نام بنی اسرائیل پڑ گیا تھا۔ یہ بھی آگے چل کر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک وہ جو حضرت موسیٰؑ اور ان کے بعد آنے والے نبیوں کو تو مانتے تھے لیکن حضرت عیسیٰؑ کا انکار کرتے تھے۔ یہ کہلاتے **یہود**۔ دوسرے وہ جو حضرت عیسیٰؑ پر بھی ایمان رکھتے تھے لا محالہ اللہ کے نبی و رسول تھے۔ البتہ ان کی اکثریت نے حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا بھی قرار دے رکھا تھا۔ وہ کہلائے **نصاریٰ** (عیسائی) ـــــ یہ دونوں گروہ بھی عرب میں آباد تھے۔ یہود کے مدینہ میں تین قبیلے تھے۔ خیبر میں ان یہود کا بہت بڑا گڑھ تھا۔ جبکہ نجران میں نصاریٰ آباد تھے۔

مخاطب دو جماعتیں

لہٰذا بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے وقت عرب میں دو جماعتیں تھیں۔ ایک تو وہ جو دین سے بہت بعید، جاہل، ـــ ان کے پاس نہ شریعت نہ کوئی آسمانی کتاب اور بدترین شرک میں مبتلا۔ دوسری جماعت وہ تھی جن کے پاس آسمانی کتاب بھی تھی گو وہ کافی محرّف ہو چکی تھی اور شریعت بھی تھی۔ کم از کم یہود شریعت رکھتے تھے گو کہ اس میں بھی کافی تحریف ہو چکی تھی۔ ان کے یہاں علماء تھے، فضلاء تھے، مفتی تھے، قاضی تھے۔ ان کا سارے کا سارا نظام برقرار تھا۔ اسی طریقہ سے نصاریٰ تورات کو بھی مانتے تھے اور ان کے پاس انجیل بھی

تھی گو اس میں بھی کافی تحریف ہو چکی تھی۔ ان کے یہاں بھی بڑے بڑے علماء تھے، احبار بھی تھے اور رہبان بھی۔ ان دونوں طبقوں کو ذہن میں رکھئے۔ اب اس پس منظر میں دعوتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ جو معاملہ ہو رہا ہے اسے سمجھئے!

دعوتِ محمدیؐ کی مخالفت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوت شروع کی اور آپ نے دیکھا کہ لوگ اس مطابق فطرت دعوت کو قبول نہیں کر رہے ہیں، ایمان نہیں لا رہے، مخالفت ہو رہی ہے، کشمکش ہو رہی ہے۔ مٹھی بھر جو سعید روحیں ایمان لے آئی ہیں ان پر تشدّد ہو رہا ہے۔ ان کو شدید ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ حالانکہ اسی مکّہ کے رہنے والے ابتدائے وحی اور آغازِ دعوتِ توحید سے قبل آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی محبت کرتے تھے۔ الصّادق کا خطاب حضورؐ کو کس نے دیا؟ الامین حضورؐ کو کس نے قرار دیا! ان ہی مکّہ والوں نے۔ وہ تو آپؐ کے قدموں تلے اپنی آنکھیں بچھاتے تھے۔ لیکن ہوا یہ کہ جب آں حضورؐ نے دعوتِ توحید شروع کی تو وہی مکّہ والے جو جان چھڑکتے تھے۔ اب وہی خون کے پیاسے ہو گئے۔

بنو ہاشم کی حمایت

ابو طالب کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت محبت تھی، طبعی اور قلبی محبت۔ وہ اگرچہ ایمان نہیں لائے تھے لیکن اس محبّت کی وجہ سے آنحضورؐ کو ان کی حمایت حاصل تھی۔ ابو طالب چونکہ بنو ہاشم کے قبیلہ کے سردار تھے۔ لہٰذا قبائلی دستور کے مطابق پورا قبیلہ سردار کے ساتھ تھا۔ چنانچہ بنو ہاشم کی حمایت حضورؐ کو حاصل تھی جو قریش کا سب سے با اثر قبیلہ تھا۔ اس لئے قریش کو نبی اکرمؐ کے خلاف کوئی براہِ راست اقدام کی جرأت نہیں ہوئی۔ قریش جانتے تھے کہ اگر ہم نے محمد کو نقصان پہنچایا (صلی اللہ علیہ وسلم) تو اس نظام کے تحت بنو ہاشم کا پورا قبیلہ خون کا بدلہ لینے کے لئے اٹھ کھڑا ہوگا۔ چاہے وہ قبیلہ ایمان نہ لایا ہوتا۔ اس طرح ایک خون ریز خانہ جنگی شروع ہو جائے گی جس کا وہ تحمّل نہیں کر سکتے۔ پورے عرب میں ان کا رعب اور دبدبہ قریش کے تمام قبیلوں کے متحد ہونے کے سبب سے تھا۔ آپس کی جنگ ان کے لئے بڑی نازک صورت حال پیدا کر دیتی اور حال یہ ہوتا کہ (A HOUSE DIVIDED AMONGST ITSELF CAN'T STAND) قریش کو اندیشہ تھا کہ اگر ہمارے مابین تفرقہ ہو گیا تو ہماری ہوا خیزی ہو جائے گی۔ اس لئے وہ آں حضورؐ کے خون کے پیاسے ہونے کے باوجود آپؐ کی جان لینے کی ہمّت نہیں کر سکتے تھے لیکن مخالفت شدید تھی اور طرح طرح سے نبی اکرمؐ اور آپؐ کے اصحابؓ کو تکلیفیں پہنچانے کا سلسلہ جاری تھا۔

اہلِ کتاب کی مخالفت

دوسری طرف دعوتِ توحید قبول کرنے کی توقع اہلِ کتاب سے ہوسکتی تھی کہ چلو قریش تو جاہل ہیں ان کے پاس کتاب نہیں، شریعت نہیں، وحی کا نور ہے ہی نہیں۔ لیکن اہلِ کتاب تو وہ لوگ ہیں جن کے پاس کتاب بھی ہے شریعت بھی ہے، دین کا علم بھی ہے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو نبی آخر الزمان کے منتظر تھے، ان کی بعثت کے لئے دعائیں مانگا کرتے تھے کہ اے اللہ تیرے آخری نبی کے ظہور کا وقت کب آئے گا۔ یہودی جب اصل عربوں سے لڑائی ہوتی تھی تو وہ مار کھاتے تھے، پٹتے تھے۔ جیسے آپ کو معلوم ہے کہ سرمایہ دار تو مار کھاتا ہے جس طریقے سے ہندوستان میں مسلمان چاہے تھوڑے ہوتے تھے، اقلیت میں ہوتے تھے لیکن جب فساد ہوتا تھا تو بنیا مار کھاتا تھا۔ یہی معاملہ یہودیوں کا ہوتا تھا۔ وہ طبعی طور پر بزدل تھے لہذا وہ مار کھاتے تھے۔ لیکن جب وہ پٹتے تھے تو کہا کرتے تھے کہ کہ ٹھیک ہے اس وقت تو ہم تم سے پٹ گئے ہیں لیکن آخری نبی کے ظہور کا وقت قریب ہے، جب ہم ان کی زیرِ قیادت تم سے جنگ کریں گے تو تم ہم پر غالب نہیں آسکو گے ـــــ یثرب میں رہنے والے اوس و خزرج کے عرب قبائل کو بھی یہودی دھمکیاں دیا کرتے تھے ـــــ یہود کی یہی دھمکیاں جس کو (IRONY OF FATE) کہیں گے، مدینہ والوں کے ایمان لانے میں سبقت کا ذریعہ بن گئیں۔

انہوں نے سن رکھا تھا کہ ہمارے یہاں یہود کے بڑے بڑے علماء ہیں، وہ یہ کہا کرتے ہیں کہ آخری نبی کے ظہور کا وقت ہے۔ لہذا جیسے ہی رات کی تاریکی میں مکہ کی وادی عقبہ میں مدینے سے آئے ہوئے چھ اشخاص کی نبی اکرمؐ سے ملاقات ہوئی۔ آپؐ تبلیغ کے لئے گشت فرما رہے تھے۔ آپؐ نے دیکھا کہ وادی عقبہ میں چھ آدمی پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ آپؐ نے ان کے سامنے دعوتِ توحید پیش فرمائی۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا کہ ہو نہ ہو یہ وہی نبی ہیں جن کی بعثت کا یہود ذکر کیا کرتے تھے۔ لہذا انہوں نے طے کیا کہ ہم سبقت کر کے آپؐ کے ہاتھ پر ایمان لے آئیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہودی سبقت کر جائیں۔ یہود کی دی ہوئی خبروں کے ذریعہ سے ان چھ حضرات کو تو ہدایت حاصل ہو گئی اور یہ ایمان لے آئے۔ لیکن یہود کے علماء کا حال وہ رہا جس کے متعلق قرآن مجید کہتا ہے: يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۔ یہ اگرچہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور قرآن مجید کو اچھی طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں لیکن اس کے باوجود آں حضورؐ کی دشمنی میں یہود سب سے آگے بڑھ گئے ـــــ وجہ یہ تھی کہ ان کا خیال تھا کہ نبی آخر الزمان ان میں سے مبعوث ہوں گے۔ ڈھائی ہزار برس سے نبوت ہمارے ہاں

چلی آرہی ہے۔ یہ تار کبھی ٹوٹا ہی نہیں لیکن ان کی توقع کے خلاف بنی اسمٰعیل میں خاتم النبیین و المرسلین کا ظہور ہو گیا۔ یہ بات ان کے لئے بہت بڑی آزمائش بن گئی کہ ہم بنی اسمٰعیل کے ایک فرد کے آگے کیسے جھک جائیں۔! وہ تو اُمّی قوم ہے، ان پڑھ قوم ہے، ان میں دین نہیں، ان کے پاس کوئی علم نہیں ہے — کہیں سے فارغ التحصیل نہیں۔ ان کے پاس کسی دارالعلوم کی سند نہیں۔ ان کے پاس کسی صاحب علم کی جانب سے کوئی (TESTIMONIAL) نہیں — ہم ان کو نبی کیسے مان لیں۔! ہم تو پھر بہت گھٹیا ہو جائیں گے۔ ہماری علمیت، ہماری سیادت، ہماری قیادت ختم ہو جائے گی۔ ان کا یہ استکبار اور پندار ان کے قبول حق کی راہ میں آڑے آگیا — !!!

نبی اکرمؐ کو تشویش

یہ ہے پس منظر اس آیت کے اگلے حصّے کے بین السطور کا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نبی اکرمؐ اپنی دعوت کے نتیجے کو دیکھ کر کچھ تشویش میں ہیں کہ لوگ کیوں ایمان نہیں لا رہے ہیں! آخر انہیں کیا ہو گیا ہے! میری دعوت کتنی صاف اور سادہ ہے۔ کتنی مطابقِ فطرت ہے۔ انسان کی فطرت کی بدیہیات کو اپیل کرنے والی ہے —! پھر کیا وجہ ہے کہ لوگ ایمان نہیں لا رہے —؟ اس پس منظر کو پیش نظر رکھئے اور اگلے حصّے کو پڑھئے۔ فرمایا:۔

كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ

"اے محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) بہت بھاری ہے مشرکین پر وہ چیز جس کی طرف آپؐ انہیں بلا رہے ہیں۔ دعوت دے رہے ہیں۔"

آپؐ اسے سادہ بات سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ دعوت توحید ان کے رائج نظام کو درہم برہم اور تلپٹ کر دینے والی ہے۔ درآنحالیکہ ان کا پورا نظام شرک پر قائم ہے۔ ان کے مفادات اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان کی چودھراہٹیں اس مشرکانہ نظام کی رہین منت ہیں۔

مشرکانہ نظام سے وابستہ مفادات

اس بات کو بھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہزار دعوتِ توحید مطابقِ فطرت ہو لیکن اس کے جو لوازم، مقتضیات اور متضمّنات ہیں ان کو وہ لوگ خوب سمجھتے ہیں جو مشرکانہ نظام میں قیادت و سیادت کے مناصب پر فائز ہوتے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اس دعوتِ توحید کی ان کے مفادات پر کہاں کہاں ضرب پڑتی ہے! دیکھئے اگر کسی بت کا استھان ہے اور لوگ وہاں آکر چڑھاوے چڑھاتے

ہیں تو کیا وہ بت کے پیٹ میں جاتے ہیں؟ وہ تو مجاوروں کے پیٹوں میں جاتے ہیں۔ وہاں کے جو پجاری اور (PRIESTS) ہیں سارے چڑھاوے تو ان کو مل رہے ہیں۔ کہنے کو وہ بت پر چڑھاوا ہے۔ اسی طور پر جو چڑھاوے قبروں پر چڑھائے جاتے ہیں، ان کے متعلق آپ نے کبھی سوچا کہ وہ جاتے کہاں ہیں! وہ سب مجاوروں اور گدی نشینوں کے پاس جاتے ہیں۔ وہ تو جب سے محکمہ اوقاف قائم ہوا ہے تو ایسی درگاہوں پر مقفل صندوق رکھ دیئے گئے ہیں کہ نقد نذر و نیاز ان میں ڈالی جائے۔ لیکن شاید آپ کو معلوم ہو کہ جب محکمہ اوقاف کا نظام زیر ترتیب تھا اسی دوران بڑی بڑی درگاہوں کے جو حضرات پشتینی سجادہ نشین تھے، وہ ان زمینوں کو جو درگاہوں اور مقبروں کے نام وقف تھیں، اپنے ناموں پر منتقل کرا چکے تھے۔ اصل دولت تو محکمہ اوقاف کے سرگرم عمل ہونے سے قبل ہی وہاں سے جا چکی تھی۔ یہ بڑے بڑے پیر جو بڑے بڑے زمیندار اور وڈیرے بنے نظر آتے ہیں یہ کہاں سے بنے ہیں۔ انہی زمینوں کی بدولت بنے ہیں جو ان مقبروں اور درگاہوں کے نام وقف کی گئی تھیں اور اب وہ ان کی ذاتی ملکیت بنی ہوئی ہیں ـــــ پس معلوم ہوا کہ شرک کا پورا نظام ہوتا ہی ہے مفادات کا ـــــ اس نظام میں تو صرف اوپر کی دکھاوے کی چیزیں ہوتی ہیں کہ یہ منادر و مقابر ہیں ـــــ یہ دیوتا اور دیویوں کے بت ہیں۔ یہ اولیاء اللہ کی قبور ہیں۔ اصل مقصد تو ان ناموں، ان استھانوں اور ان درگاہوں کی آڑ میں قیادت و سیادت اور حصول دولت ہوتا ہے۔ سومنات کے مندر کے اندر جو دولت تھی وہ کس کی ملکیت تھی! وہاں کے پجاریوں کی ملکیت تھی۔ لہٰذا مشرکین کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ نظام توحید قائم و نافذ ہو ـــــ

آیت کے اس حصہ کے بین السطور نبی اکرمؐ کو تسلّی و تشفّی دی جا رہی ہے کہ اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ٹھیک ہے کہ آپؐ جو دعوت دے رہے ہیں وہ فطرت کے مطابق، عقل کے مطابق اور بالکل سیدھی بات ہے ـــــ توحید سے بڑھ کر سیدھی بات اور کونسی ہوگی! توحید کے سوا مطابقِ فطرت بات کونسی ہو گی! توحید سے بڑھ کر مطابقِ عقل بات کونسی ہوگی! لیکن کسی بات کا مطابقِ فطرت و عقل ہونا اس کے قابل قبول کرنے کے لئے کافی نہیں۔ یہاں تو مسئلہ آتا ہے مفادات کا، چودھراہٹ کا، اس بات کا کہ مسند اور سجادہ محفوظ رہتا ہے کہ نہیں! وجاہت اور قیادت پر تو آنچ نہیں آرہی! اور ظاہر بات ہے کہ دعوت توحید ان تمام بتوں کو خواہ وہ مٹی اور پتھر کے ہوں، خواہ مفادات، قیادت، سیادت کے ہوں توڑ پھوڑ کر اور ملیامیٹ کر کے رکھ دیتی ہے۔ لہٰذا مشرکین پر یہ دعوت

بہت بھاری ہے۔ یہ اسے آسانی سے ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا فرمایا:

كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ ۚ

اضطراب کا فطری سبب

میں نے کئی بار عرض کیا ہے کہ ایک کریم اور شریف النفس انسان جبکہ رسالت کی ذمہ داری بھی اس کے سپرد ہو یہ سوچتا ہے کہ کہیں میرے اندر تو کوئی نقص نہیں! لوگ جو ایمان نہیں لا رہے تو میری کوشش میں تو کوئی کمی نہیں۔ میری محنت میں تو کوئی کوتاہی نہیں۔! دعوت دینے کے میرے انداز میں تو کوئی خامی نہیں۔ انبیاء اور رسل علیہم السلام تو اس بارے میں بے نہایت تشویش میں مبتلا ہوتے ہیں چونکہ ان کو یہ ضابطۂ الٰہی معلوم ہوتا ہے کہ: فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ "پس یہ لازماً ہو کر رہنا ہے کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں گے کہ جن کی طرف ہم نے رسول بھیجے ہیں اور رسولوں سے بھی پوچھیں گے"۔ یعنی یہ کہ انہوں نے رسالت کے فرض منصبی کو کہاں تک اور کس طرح انجام دیا؟ ——— لہٰذا حضورؐ کو یہ تشویش ہوتی تھی کہ کہیں میری کوئی کوتاہی نہ ہو جس کے باعث مجھے اللہ کے ہاں جواب دہی کرنی پڑ جائے ———

نبی اکرمؐ کی دلجوئی

قرآن مجید میں بار بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف اسالیب سے جو تسلّی دی گئی ہے اور آپؐ کی دلجوئی فرمائی گئی ہے وہ اسی لئے کہ آں حضورؐ لوگوں کے ایمان نہ لانے[1] پر تشویش میں مبتلا ہو کر اپنی جان کو نہ گھلائیں: لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۝ "(اے نبی!) شاید آپؐ (رنج، صدمے، تشویش اور غم میں) اپنی جان کھو دیں گے کہ یہ لوگ ایمان (کیوں) نہیں لاتے"۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ: فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ

---

[1] اس موقع پر سورۃ النساء کی آیت نمبر ۴۱ بھی پیش نظر رہے۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرمؐ نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے قرآن سنانے کی فرمائش کی اور وہ جب اس آیت پر پہنچے تو حضورؐ نے فرمایا: حَسْبُكَ حَسْبُكَ ——— حضرت عبداللہ ابن مسعود کہتے ہیں کہ "اس موقع پر جب میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو تھے"۔ یہ اس فرض منصبی کی گہرائی کا گہرا احساس تھا جو آنحضرتؐ کے سپرد کیا گیا تھا۔ آیت یہ ہے: فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا "اے نبی غور کیجئے کہ اس روز کیا ہو گا جب ہم ہر امت پر (اس کے رسول کو) بطور گواہ لائیں گے اور (اے نبی) آپؐ کو ان سب پر گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے"۔ (مرتب)

الدُّعَاءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ ○ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ (اے نبی) آپ مُردوں کو نہیں سنا سکتے نہ بہروں تک اپنی دعوت، اپنی پکار پہنچا سکتے ہیں جو پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں اور نہ ہی آپ اندھوں کو سیدھا راستہ بتا کر بھٹکنے سے بچا سکتے ہیں ـــــ یہ وہ لوگ ہیں جو اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ـــ "(ان کے کفر پر اڑے رہنے کے باعث) اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے۔ ان کے کانوں اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے"۔ بظاہر یہ چلتے پھرتے نظر آ رہے ہیں لیکن حقیقت میں یہ مر چکے ہیں۔ ان کی معنوی موت واقع ہو چکی ہے۔ بظاہر ان کے پاس سماعت بھی ہے بصارت بھی ہے لیکن معنوی اعتبار سے یہ بہرے اور اندھے ہیں۔ یہ چلتے پھرتے مقبرے ہیں۔ یہ چلتے پھرتے حیوانات ہیں۔ ان کے اندر کا انسان مر چکا ہے ـــــ آپ کی تبلیغ و دعوت میں کوئی کمی نہیں ہے لہٰذا آپ تشویش نہ کریں۔ آپ یہ فکر دامن گیر نہ کریں کہ یہ ایمان کیوں نہیں لا رہے ـــ!! اس تمام پس منظر، تشریح و توضیح کو پیش نظر رکھ کر اب آخری بار پھر آیت کے اس حصہ کو دیکھئے کہ:

كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ

اس آیت مبارکہ کے آخری حصہ میں علمی اعتبار سے ایک اہم مضمون آ رہا ہے۔ اسے بھی توجہ کے ساتھ سنئے اور ذہن نشین کرنے کی کوشش کیجئے ـــــ فرمایا:

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ○

"اللہ ہی کھینچ لیتا ہے اپنی طرف جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے اپنی جانب اسکو جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے"۔

یہ بڑی اہم بات ہے۔ کسی شخص کے راہ ہدایت پر آنے کے دو طریقے ہیں۔ یہ مختلف طبائع اور مزاج کی بات ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کو تو اللہ ہی فیصلہ کر کے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور بعض لوگ محنت کر کے کوشش کر کے رجوع کر کے اللہ کے راستے کی طرف آتے ہیں۔

اجتباء اللہ تبارک و تعالیٰ کی شان یہ بھی ہے کہ وہ چاہے تو کسی راہ چلتے کو بلا لے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے اہل و عیال کے ساتھ مدین سے مصر جا رہے تھے کہ راستہ ہی سے کھینچ بلایا، اور کوہ طور پر نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا۔ آپ سے کلام فرمایا، وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔ وہ کلیم اللہ ہو گئے۔ حضرت عمر گھر سے ننگی تلوار لے کر اس حضورؐ کے قتل کے پختہ ارادے سے نکلے تھے

لیکن راستہ ہی سے ان کا رُخ اپنی ہمشیرہ کے گھر کی طرف پھیرنے کے اسباب پیدا فرما دیئے جو خود
ان کے شوہر حضرت سعید ابن زیدؓ ایمان لا چکے تھے۔ بہن کی عزیمت دیکھ کر حضرت عمرؓ کا دل مو
ہوا۔ کلامِ الٰہی سننے کی خواہش کی اور سن کر دل کی کایا ہی پلٹ گئی۔ حجابات دور ہو گئے۔ وہی ننگی تلوا
جو قتل کے ارادے سے لے کر گھر سے نکلے تھے غلاموں کی طرح گلے میں ڈال کر حضورؐ کی خدمت میں
حاضر ہوئے اور مشرف بہ اسلام ہو کر جاں نثارانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل ہو گئے۔ دربارِ نبویؐ
فاروق کے لقب سے سرفراز ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی
اجتباء ہوا۔ آں حضورؐ کو مکہ میں دعوتِ توحید دیتے ہوئے چھ سال بیت گئے تھے۔ آپؐ کی شدید
مخالفت ہو رہی تھی لیکن حمزہ ان سب سے بے نیاز اپنے مشاغل میں لگے رہتے تھے جن میں نمایاں
شوق تیر کمان لے کر علی الصبح شکار کو نکل جانا اور شام کو واپس آنا تھا۔ ایک شام جب واپس آئے تو لونڈی
نے اس زیادتی کا ماجرا سنایا جو اس روز ابوجہل نے آں حضورؐ کے ساتھ کی تھی۔ قرابت داری کے جذبہ
نے جوش کھایا۔ پہلے تو جا کر کمان سے ابوجہل کا سر پھاڑا اور کہا لو میں بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لاتا
ہوں۔ پھر حضورؐ کی خدمت میں آ کر فی الواقع مشرف باسلام ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ
اسد اللہ و اسد رسولہ اور سید الشہداء کے القاب سے ملقب ہوئے۔

انابت دوسری قسم کے لوگ خود ہدایت کے طالب ہوتے ہیں۔ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے
کہ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ جو ہدایت کا طالب ہے اسے ہم ہدایت دیں گے۔ اس نے
تو گویا ہم پر اپنا حق قائم کر دیا۔ اس لئے کہ وہ خود طالب ہدایت ہے۔ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا
لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ جو لوگ ہمارے لئے محنتیں کریں۔ کوشش کریں۔ ہدایت کے طالب بنیں
اس کے لئے قربانیاں دیں ان کے لئے ہمارا پختہ وعدہ ہے کہ ہم انہیں لازماً اپنے راستہ کی ہدایت
دیں گے ــــ یہی بات یہاں فرمائی کہ وَیَهْدِیْٓ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ۝ "اللہ ہدایت دیتا ہے اپنی جانب
جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے"۔ جو بھی حق کا طالب اور متلاشی ہے۔ جس کے دل میں بھی انابت
ہے۔ جس میں حق کی طلبِ صادق ہے جو کسی تعصب اور عصبیت میں مبتلا نہیں ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ
راہِ ہدایت دکھاتا ہے اور اس پر اس کو لے آتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کی درخشاں
مثال ہیں۔ وہ اپنی فطرتِ سلیمہ اور طلبِ حق کی بنیاد پر صدیق اکبر کے مقام ارفع پر فائز ہوئے ــــ
عشرہ مبشرہ میں اکثر وہی حضراتِ گرامی شامل ہیں جو راہِ حق کے از خود جویا تھے۔ حضرت سلمان فارسیؓ
ہیں جو طلبِ حق میں کہاں سے روانہ ہوئے، کن کن منازل پر ٹھہرے اور پھر کس طرح دامنِ محمدیؐ
سے وابستہ ہوئے۔ یہ انابت الی اللہ کی درخشاں مثالیں ہیں۔

صوفیاء کی دو اصطلاحات
سالک مجذوب اور مجذوب سالک

ہمارے یہاں صوفیاء میں دو اصطلاحیں رائج ہیں۔ ان کے نزدیک کچھ ہوتے ہیں سالک مجذوب اور کچھ ہوتے ہیں مجذوب سالک۔ سَلَکَ عربی کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں چلنا ___ لہٰذا سلوک کے معنی راستہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح طریق اور طریقت بھی چلنے اور راستہ کو کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک سالک مجذوب وہ ہیں جو خود چل کر اللہ کی طرف آتے ہیں اور اللہ ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ بھی لیتا ہے، انہیں ہدایت دیتا ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے رجوع کیا ہے ___ جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ، وہ تو پہلے سے حق کے متلاشی ہیں۔ اسی راستے پر چلے آرہے ہیں حقیقت کے دروازے پر وہ بھی دستک دے رہے تھے۔ یہ الگ حقیقت ہے کہ دروازہ کھلا جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے۔ اسی لئے انہوں نے فوراً تصدیق کی اور حضورؐ کے ہاتھ پر ایمان لے آئے۔ انہیں تصدیق کرنے میں ایک لمحہ نہیں لگا۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے کہ جس کو میں نے دعوت پیش کی ہو اور اسے کچھ نہ کچھ تردّد نہ ہوا ہو اور اس نے کچھ نہ کچھ توقف نہ کیا ہو سوائے ابوبکر کے رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ وجہ یہ تھی کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا

دوسرے درجے پر ہیں مجذوب سالک۔ یہ وہ ہیں جن کو پہلے اللہ تعالیٰ خود ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور انہیں ہدایت دیتا ہے۔ پھر ان کو تربیت کے مراحل سے گزار لے جاتا ہے جیسے حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

یہ مفہوم ہے سالک مجذوب اور مجذوب سالک کا ___ صوفیاء نے یہ اصطلاحات شاید آیت کے اسی حصہ سے اخذ کی ہیں کہ: اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝ "اللہ جسے چاہتا ہے چن کر اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور جو خود اس کی طرف رجوع کرے تو اللہ اسے لازماً ہدایت دیتا ہے"

اہلِ ایمان کو تسلی

آیت کے اس حصے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے توسط سے اہل ایمان کے لئے تسلی و تشفی کا پہلو بھی موجود ہے کہ مکہ کے مشرکین کی شدید مزاحمت و مخالفت اور جور و تعدی نیز انتہائی مایوس کن حالات سے دل برداشتہ نہ ہوں ___ اللہ تعالیٰ راستہ کھولے گا اور وہ تبارک و سبحانہ و تعالیٰ کچھ لوگوں کو اپنے دین کی طرف کھینچ لے گا اور ان مشرکین میں جو نیک سرشت ہوں گے، جن کی فطرت سلیم ہوگی، جن کی عقل سلیم ہوگی، جن میں

ذرا بھی انابت ہوگی، وہ خود چل کر آجائیں گے۔ اللہ ان کو بھی رہِ ہدایت سے بہرہ مند فرمائیگا۔

اہلِ کتاب کی مخالفت کا سبب

اب آگے والی آیت میں دوسری جماعت یعنی اہلِ کتاب کی مخالفت کے سبب کو اختصار لیکن انتہائی جامعیت و بلاغت سے بیان فرمایا جارہا ہے۔ مشرکین عرب تو بے علم تھے۔ اَن پڑھ تھے۔ ان کے پاس شریعت نہیں۔ وہ وحی، نبوت و رسالت اور انزال کتب سماوی سے بالکل ناآشنا۔ ان کے مقابلہ میں تھے یہود اور ان کے علماء و فضلاء۔ ان کے پاس کتاب، ان کے پاس شریعت، وحی اور انزالِ کتبِ سماوی سے وہ واقف، سلسلۂ نبوت و رسالت سے وہ آشنا۔ توحید سے وہ روشناس، بعث بعد الموت کے وہ قائل، حساب کتاب اور جنّت و دوزخ کے وہ مقر۔۔۔۔ ان کے لئے تو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی دعوتِ توحید میں کوئی اجنبیّت نہیں تھی۔ کوئی نرالی اور انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ تو خود نبی آخر الزمان کے ظہور کے منتظر تھے۔ جن کتابوں کو وہ خود آسمانی کتابیں تسلیم کرتے تھے ان میں یہ پیشین گوئیاں موجود تھیں کہ خاتم النبیین والمرسلین کی بعثت فاران کی چوٹیوں اور کھجوروں کے جھنڈ کی سرزمین میں ہوگی۔ وہیں ان کا ظہور ہوگا جس سے مراد حجاز کے علاقہ کے سوا کوئی دوسرا مقام نہیں ہوسکتا[۱] حضرت سلمان فارسیؓ ایک عیسائی راہب سے یہ اطّلاع پاکر ہی حجاز کے لئے عازم سفر ہوئے تھے۔۔۔۔ پھر یہود اوس و خزرج کو دھمکیاں دیتے تھے کہ آخری نبی کے ظہور کا زمانہ قریب ہے، جب ہم ان کی زیرِ قیادت تم سے جنگ کریں گے تو لازماً تم پر غالب آئیں گے۔ لیکن قرآن شہادت دیتا ہے کہ یہ یہود آں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی مخالفت میں مشرکین سے بھی زیادہ شدید تھے اور آپؐ کی دعوتِ توحید کے خلاف قریش اور عرب کے دوسرے قبائل سے ریشہ دوانیوں اور سازشیں کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ فتنہ و فساد کو اکسانے میں پیش پیش رہتے تھے۔۔۔۔ ان کی مخالفت کے سبب کو اگلی آیت میں بیان

---

[۱] ممکن ہے کہ اسی وجہ سے یہود کے تین بڑے قبیلے فلسطین اور شام کے علاقے چھوڑ کر مدینہ اور خیبر میں آکر آباد ہوئے ہوں۔ اور اوس و خزرج کے قبیلوں کو نبی آخر الزمان کے ظہور کی خبریں دیتے ہوں۔ (مرتب)

کیا گیا ہے۔ اس آیت مبارکہ کے بھی ــــ شَرَعَ لَکُمْ والی آیت کی طرح تین حصّے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ تینوں حصّوں کی علیحدہ علیحدہ تشریح و توضیح کروں۔ فرمایا:

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ؕ

"اور ان لوگوں نے تفرقہ نہیں کیا مگر اس حال میں کہ ان کے پاس علم آچکا تھا (بلکہ تفرقہ کا سبب یہ تھا) کہ وہ ایک دوسرے پہ زیادتی کریں"

سیاقِ کلام سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ آیت کے اس حصّے میں اہل کتاب کے تفرقہ کا ذکر ہے۔ اسی آیت کے آخری حصہ میں وراثتِ کتاب کا ذکر آرہا ہے۔ وارثِ کتاب تو یہود و نصاریٰ ہی تھے۔ آیت کے اس حصہ میں تفرقہ کا سبب نہایت جامعیت اور بلاغت سے بیان ہورہا ہے کہ ان اہل کتاب نے جو تفرقہ کیا ہے۔ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے، اور منقسم ہوگئے ہیں تو اس کا باعث لاعلمی نہیں بلکہ ــ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ہے ــــ دیکھئے کتنی عجیب بات ہے۔ دین و شریعت ایک ہے۔ یہود و نصاریٰ دونوں تورات کے ماننے والے ہیں۔ پھر بھی تفرقے میں مبتلا ہیں۔ پھر تفرقہ در تفرقہ ہے۔ یہود بھی مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور نصاریٰ بھی۔ اور ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں[1]۔ حالانکہ پوری تاریخ مشترک۔ آج بھی عیسائی جس کتاب کو بائبل کہتے ہیں، اس کا بڑا حصہ تو "عہد نامہ عتیق" (OLD TESTAMENT) ہے۔ یہ دراصل تورات اور دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کے صحیفوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد "عہد نامہ جدید" (NEW TESTAMENT) ہے۔ جس میں چار کتابیں وہ ہیں جو "اناجیل اربعہ" کہلاتی ہیں ــ ان کے بعد پال اور دوسروں کے خطوط ہیں، جن کو وہ "رسولوں کے خطوط" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہودی جن انبیاء کو مانتے ہیں، عیسائی بھی ان سب کو مانتے ہیں لیکن باہمی تفرقہ ہے ــــ ایک دوسرے کے خلاف فتوے ہیں۔ یہ سب کیوں اور کس لئے ہے؟ میں یہ ساری باتیں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ جب بھی کوئی توحید کی خالص دعوت لے کر اٹھے گا۔ حالات یہی ہوں گے۔ اسے اسی نوع کے حالات سے سابقہ پیش آکر رہے گا۔ یہ صورتِ حال کبھی نہیں بدلے گی ــ بقول علامہ اقبال ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز ؎ چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

---

[1] موجودہ دور میں صرف اسلام دشمنی میں عیسائی ان یہود کے حامی، پشت پناہ اور حلیف بن گئے ہیں۔ درآنحالیکہ ان کے عقیدے کے مطابق حضرت مسیح کو صلیب پر چڑھوانے والے یہودی تھے۔ (مرتب)

آج بھی اگر تجدید و احیاءِ دین کے لئے اور خالص دعوتِ توحید کے لئے کمر کس کے کوئی قافلہ چلے گا تو اسے انہی نوع کے دو گروہوں سے واسطہ پڑے گا اور سابقہ پیش آئے گا۔ جیسے دورِ حاضر میں ایک تو ہمارے عوام الناس ہیں کہ جن کو دین کی کوئی خبر نہیں۔ ان کے نزدیک دین نام ہے محض ایک عقیدے کا اور چند رسومات کا۔ ان کو حقیقی دین کا علم سرے سے ہے ہی نہیں ——— ان کا دین تو قبر پرستی ہے یا تعزیہ پرستی۔ ان کے دین کا سب سے بڑا مظہر یا عرس ہے یا تعزیوں کے جلوس ہیں۔ یا اب ایک اور جلوس کا اضافہ ہو گیا ہے جو عید میلاد النبی کا جلوس ہے ان کا دین تو ان ہی چیزوں کا نام ہے ان کے سوا ان کو دین کا اور کوئی علم اور خبر ہے ہی نہیں۔ نماز سے انہیں سروکار نہیں روزے سے انہیں بحث نہیں۔ ان کا کل کا کل دین بس ان چیزوں کا نام ہے۔ یہ گروہ تو گویا ان لوگوں کے مشابہ ہو گیا جو حقیقتِ نفس الامری سے بہت دور نکل گیا تھا۔ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا۔ ان کے لئے خالص توحید والے دین کی طرف آنا بڑا ہی مشکل ہے۔ آسان کام نہیں ہے۔ اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہ۔ ہمارے یہاں دوسرا گروہ وہ ہے جن کے فتوے چلتے ہیں۔ دین کے مسائل کے لئے جن کی طرف لوگوں کا رجوع ہے۔ جن کی دینی مسندیں ہیں۔ جن کے اونچے اونچے مناصب ہیں۔ ان میں سے خاص طور پر جن کا سرکار دربار سے ربط و تعلق قائم ہو جائے وہ تو یوں سمجھئے کہ کریلا اور نیم چڑھا۔ ان میں جو جو خرابیاں پروان چڑھتی ہیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ علمائے سوء کی اکثریت بھی اکثر و بیشتر ان ہی میں سے ہوتی ہیں جو سرکاری درباری علماء ہوتے ہیں۔ ایسے ہی علماء سوء کے فتووں سے حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی پیٹھ پر کوڑے برستے رہے ہیں۔ ایسے ہی علماء کے فتووں سے مجددالف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کو جیل میں ڈالا گیا ہے۔ ان ہی کے فتووں سے امام ابو حنیفہؒ جیل میں ڈالے گئے اور ان کو کوڑے لگائے گئے۔ جب امام مالکؒ کی مشکیں کس کے کوڑے لگے ہیں اور گدھے پر بٹھا کر ان کی مدینہ کی گلیوں میں جو تشہیر کی گئی ہے تو کیا اس کی پشت پر اس وقت کے درباری مفتیان کے فتوے موجود نہیں تھے۔ جن کے فتاویٰ اس وقت کی حکومت کو حاصل نہ ہوں! یہ درباری سرکاری اقتدارِ وقت کے منہ چڑھے ہی تو عالم و فاضل لوگ تھے جنہوں نے جلال الدین اکبر کو "دینِ الٰہی" عطا کیا تھا اکبر کا تو باپ بھی دینِ الٰہی خود تجویز نہیں کر سکتا تھا۔ اس کو مرتب کرنے والے تو ابوالفضل اور فیضی تھے جو بہت بڑے عالم تھے۔ اتنے بڑے عالم کہ ابوالفضل نے قرآن مجید کی پوری تفسیر اس طور پر لکھ دی کہ اس میں کوئی حرف نقطہ والا نہیں آیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ حال ہی میں سیرتِ مطہرہ پر ایک ایسی

کتاب بھی لکھی گئی ہے جس میں نقطہ والا کوئی حرف نہیں آیا جس کی صدرِ مملکت صاحب کی جانب سے بڑی مدح کی گئی ہے۔ یہ تو سیرت کی کتاب تھی۔ ابو الفضل نے تو قرآن کی پوری تفسیر لکھی کہ جس میں کوئی نقطہ والا حرف نہیں آیا۔ میرے علم میں نہیں ہے کہ اس تفسیر پر علماء نے کوئی نکیر کی ہو۔ ممکن ہے کہ تفسیر میں اس نے کچھ گڑبڑ نہ کی ہو لیکن یہ وہی شخص ہے جو اکبر کے لئے "دینِ الٰہی" تصنیف کر رہا ہے۔ اور اکبر کی اس راہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہے[1]۔ لہٰذا جب بھی منظم طور پر توحید کی دعوت اٹھے گی یہ دو طرفہ یلغار ہو گی۔ مخالفتیں ہوں گی۔ ابتلاء اور آزمائش اسی طور سے آئیں گی جیسے اس وقت آئی تھیں۔

اس آیت کے اس حصہ کے مفہوم لفظ کے بین السطور (BETWEEN THE LINES) اگر آپ دیکھیں گے اور (READ) کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ ہیں وہ مراحل و ادوار جو خالص دعوتِ توحید کے نتیجے میں ہمیشہ آکر رہیں گے۔ ایک وہ عوام یا جہلاء جو دین سے دور نکل گئے ان کو دین سے کوئی سروکار ہی نہیں۔ کوئی تعلق ہی نہیں۔ سوائے بدعات، رسومات اور خرافات کے وہ دین سے کوئی واسطہ اور علاقہ رکھتے ہی نہیں۔ ایک وہ جن کا پڑھنا پڑھانا بھی ہے۔ دین سے تعلق بھی ہے۔ مسندیں بھی ہیں۔ فتاویٰ بھی ہیں۔ ارشاد بھی ہے، سب کچھ ہے۔ لیکن اِلّا ماشاءاللہ حال یہ ہے: وَمَا تَفَرَّقُوٓا اِلَّا مِنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡعِلۡمُ بَغۡيًاۢ بَيۡنَهُمۡ‌ؕ

تفرقے کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ حق جب آئے تو وہ واضح نہ ہو۔ گنجلک ہو۔ تو اس کی اس آیت کے آغاز میں نفی کر دی گئی ہے کہ وَمَا تَفَرَّقُوٓا اِلَّا مِنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡعِلۡمُ پس معلوم ہوا کہ تفرقہ کا باعث لاعلمی اور ناواقفیت نہیں ہے: "العلم" ان تک پہنچ چکا تھا۔ ہدایتِ ربانی اور حق جب بھی آیا ہے بہت مبرہن، واضح اور بینہ بن کر آیا ہے۔ آخری پارے کی سورۂ بیّنہ میں بھی یہ مضمون آیا ہے۔ فرمایا: وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ اِلَّا مِنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنَةُ ؕ "جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی انہوں نے تفرقہ نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس "البینۃ" آگئی تھی ــــــ یعنی حق روشن و مبرہن صورت میں ان کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا۔ ان اہلِ کتاب نے اندھیرے میں ٹھوکر نہیں کھائی بلکہ روزِ روشن میں جان بوجھ

---

[1] امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے قرآن مجید کا جب فارسی کا ترجمہ کیا تھا تو وقت کے علماء نے شاہ صاحب کے خلاف کفر کا فتویٰ دیدیا تھا چنانچہ عوام کے ایک گروہ نے اسی فتوٰی سے متاثر ہو کر شاہ صاحب پر دہلی کی جامع مسجد فتحپوری میں ان کو قتل کرنے کے لئے یلغار بھی کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں بچالیا تھا۔ (مرتب)

کہ وہ راہِ حق سے منحرف ہیں۔ ٹھیک ہے اہلِ عرب نے ٹھوکر کھائی، مکّہ والوں نے ٹھوکر کھائی تو اندھیرے میں کھائی۔ ان کے پاس تو روشنی تھی ہی نہیں لیکن یہود تو اندھیرے میں نہیں تھے۔ وہ تو نبی اکرمؐ اور قرآن کو ایسے پہچانتے تھے جیسے اپنے بیٹوں کو: یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ ـــــ پھر بھی ایمان نہیں لا رہے۔ کیوں؟ اس کو آیت کے اس حصے کے آخر میں بیان کیا گیا: بَغْیًا بَیْنَھُمْ ـــــ اس تفرقے کا اصل محرک ہے۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی خواہش اور کوشش۔ ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کی تمنا اور سعی۔ ایک دوسرے پر فوقیت آنے کی فکر۔ پھر قومی و گروہی مفادات۔ مناصب، تفاخر، وجاہت و حشمت، مذہبی قیادت و سیادت، ان پر مستزاد ہے تکبر اور حسد کہ یہ فضیلت بنی اسمٰعیل کو کیوں مل گئی۔ یہ تو ہمارے خاندان کی میراث ہے۔ ڈھائی ہزار برس تک نبوّت کا سلسلہ ہمارے یہاں جاری رہا ہے۔ کسی اور کو یہ فضیلت مل جائے، یہ ہمارے لئے قابلِ قبول نہیں ہے۔ آج کل کی اصطلاح میں یہ (PERSONALITY CLASH) تھا۔ یہ شخصیتوں کا تصادم تھا۔ یہ کون اوپر اور کون نیچے کا جھگڑا تھا۔ بالاتر کون ہے اور کمتر کون! یہ سارا فساد دراصل اس کا تھا۔ یہ لوگوں کی انانیت تھی۔ جس کے باعث وہ تفرقے میں مبتلا تھے۔ انہوں نے اپنی دنیوی اغراض اور مصالح کی خاطر حق سے اعراض ہی نہیں بلکہ اس کی مخالفت اور دشمنی پر کمر کس رکھی تھی۔ اب ان تمام تشریحات و تصریحات کے ساتھ۔ آیت کے اس حصے کو پھر دیکھ لیجئے: وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْیًاۢ بَیْنَھُمْ ؕ

اب اگلی آیت پر آئیے۔ فرمایا:

وَلَوْلَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّکَ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی لَّقُضِیَ بَیْنَھُمْ ؕ ـــــ

"اور اگر (اے محمدؐ) آپؐ کے رب کی طرف سے ایک کلمہ طے نہ ہو چکا ہوتا، ایک وقتِ معیّن تک کے لئے بات طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے مابین قصہ چکا دیا جاتا۔"

یعنی ابھی مہلتِ عمر ہے۔ افراد کو بھی اس وقت تک کے لئے مہلت ہوتی ہے جب تک موت نہیں آتی۔ مَا لَمْ یُغَرْغِرْ۔ جب تک موت کا گھنگرو نہیں بولتا، توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ ہر نفس کے لئے یہ ضابطہ مقرر ہے کہ وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُھَا ؕ "اللہ کسی کو قطعی مہلتِ عمل نہیں دیتا جب موت کا مقررہ وقت آجاتا ہے۔" اجلِ مسمّٰی کے اندر اندر عمل کا اختیار رہے۔ یہ مہلت و اختیار نہ ہو تو پھر آزمائش کیسی؟ بالجبر اگر اللہ ہدایت دے دے

تو اس ہدایت پر انعام کیسا! بالجبر کسی کو غلط راستے پر ڈال دے تو اس کی سزا چہ معنی دارد! لہٰذا اللہ عزّ وجلّ یہ اختیار اور مہلت دیتا ہے، افراد کو بھی اور امتوں کو بھی۔ چنانچہ فرمایا کہ ہماری طرف سے مہلت کا ضابطہ پہلے ہی سے مقرر ہے۔ ابھی ان کو ڈھیل دینی ہے۔ ابھی ان کے لئے مہلت عمل ہے۔ ابھی ان کو اختیار حاصل ہے جدھر چاہیں جائیں۔ اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوْرًا۔ دریہ کہ: وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ۔ اگر ہمارا یہ ضابطہ اور قانون نہ ہوتا "ہماری یہ سنّت نہ ہوتی تو ہم ان کا قصہ چکا دیتے۔ ابھی جھگڑا طے کر دیتے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علاحدہ کر دیتے

آیت کے اس حصے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم اور آپؐ کے توسط سے اہل ایمان کے لئے بھی تسلّی کا ایک پہلو موجود ہے کہ تشویش نہ کیجئے۔ ابھی وقت لگے گا۔ اللہ کا آخری فیصلہ آکر رہے گا۔ احقاقِ حق اور ابطال باطل ہو کر رہے گا۔ اور انجام کار کے طور پر سب کو ہمارے حضور حاضر ہونا ہی ہے۔ وہ فیصلہ کی آخری ساعت بھی آکر رہے گی — اجل مسمّٰی تک آپؐ بھی انتظار کیجئے اور مخالفین بھی۔ اس تشریح اور توضیح کے ساتھ آیت کے اس حصہ کو پھر پڑھئے! وَلَوْلَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّکَ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی لَّقُضِیَ بَیْنَھُمْ ط

وارثین کتاب کا نقشہ

اب اس آیت کے آخری حصہ پر آئیے! فرمایا:۔

وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْکِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِھِمْ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ مُرِیْبٍ ۝

"اور وہ لوگ جو کتاب کے وارث بنائے گئے، ان کے بعد درحقیقت وہ اس (کتاب) کے بارے میں ایسے شک اور شبہ میں مبتلا ہو چکے ہیں جس نے ان کے دلوں میں خلجان پیدا کر دیا ہے"

آیت کے اس ٹکڑے کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے — یوں تو قرآن مجید کا ہر لفظ اور ہر آیت عظمت کی حامل ہے لیکن میرا گہرا تاثر ہے کہ سورۂ شوریٰ کی زیر درس یہ تین آیات عظیم ترین آیات میں سے ہیں۔ اقامت دین کی جد و جہد میں جو بھی (PROBLEMS) سامنے آتے ہیں ان سب کا حل اور جواب ان تین آیات میں موجود ہے۔ جب کبھی یہ کوشش ہو گی تو اس وقت جو مسائل اٹھیں گے

ان سب کے لئے یہاں رہنمائی موجود ہے۔ فرمایا: اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْکِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ ۔ رسولوں کے امتی عاملین کتاب تشکیک میں مبتلا ہو چکے ہیں جس نے ان کے اذہان و قلوب میں خلجان اور انتشار پیدا کر دیا ہے۔ یہ کتاب کے ماننے اور جاننے والوں کا حال ہے۔ جو امیین ہیں ان کی کیفیت یہ نہیں ہے اس لئے کہ ان کے پاس تو سرے سے کوئی کتاب ہے ہی نہیں۔ یہ گفتگو درحقیقت اہلِ کتاب کے بارے میں ہو رہی ہے کہ جن کے پاس علم، کتاب اور شریعت موجود ہے وہ سب نام لیوا ایک رسول کے ہیں لیکن آپس میں دست و گریبان ہیں[1] نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آئندہ نسلوں کا اعتماد ہی اٹھتا چلا جاتا ہے ــــ آج آپ جو دیکھ رہے ہیں کہ ہماری نوجوان نسل کا اعتماد ہی دین سے اٹھتا چلا جاتا ہے۔ وہ کیوں؟ اس لئے کہ ان کا روز کا مشاہدہ ہے کہ ملک کے علماء حضرات کی اکثریت دین کی نام لیوا ہے لیکن ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ سب کہتے یہ ہیں کہ ہمارا مقصد ہے کہ دین کو قائم کیا جائے۔ اسلامی نظام بالفعل نافذ ہو لیکن ایک دوسرے کی ٹانگیں گھسیٹی جا رہی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کا کیا منفی اثر ہمارے معاشرے پر پڑ رہا ہے۔ لوگ اندھے بہرے تو نہیں ہیں۔ نوجوان بڑے حساس ہوتے ہیں۔ تفرقہ کا یہ نقشہ دیکھ کر انہیں پھر دین ہی کے بارے میں شک پڑ جاتا ہے اور وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ قرآن مجید دعویٰ کرتا ہے کہ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ لیکن نوجوان دیکھتا ہو کہ نمازی تو بڑا پکا ہے لیکن جتنا پکا نمازی ہے اتنا بڑا بلیک مارکیٹر بھی ہے۔ اس کا اعتماد نماز پر قائم ہوگا کہ ہٹے گا! نماز پر سے اعتماد ہٹے گا۔ قرآن پر سے اعتماد ہٹے گا کہ قرآن دعویٰ کر رہا ہے کہ نماز بُرے کام سے روکنے والی شے ہے اور یہ سب کچھ کر رہا ہے اور اس کے ساتھ نمازی بڑا پکا ہے۔ ایسے ہی ہمارے معاشرے میں وہ لوگ ہیں جو کثرت کے ساتھ حج اور عمرہ کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اسمگلر بھی ہیں۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ یہ وہ چیزیں ہیں کہ جن کے باعث نوجوانوں کا دین پر سے اعتماد اٹھنا شروع ہو جاتا ہے ــــ اسی غلط طرزِ عمل کی عکاسی کی گئی ہے آیت کے اس حصہ میں: وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْرِثُوا الْکِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ " اور جو لوگ وارث بنائے گئے کتاب کے ان کے بعد" یہاں غور کیجئے کہ "ان کے بعد" سے کیا مراد ہے۔! وہ لوگ جو تفرقے ڈال کر چلے گئے، اب ان کے بعد اگلی نسل کتاب الٰہی کی وارث ہوئی ــــ جیسے ہم قرآن حکیم کے وارث ہیں ــــ یہاں جو ذکر ہو رہا ہے وہ تورات اور انجیل کا ہو رہا ہے۔ لیکن جو لوگ تفرقے ڈال گئے تو ان کے بعد آنیوالے

---

[1] اشارہ ہے یہود و نصاریٰ کے متعدد فرقوں کی طرف (مرتب)

ان تفرقوں کے سبب سے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے۔ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ○ یہاں مریب شک کی صفت ہے۔ شک جب دل میں یہ خلجان پیدا کر دے کہ پتہ نہیں کچھ ہے بھی یا نہیں؟ واقعتاً یہ کتاب الٰہی ہے کہ نہیں؟ یہ گروہ بھی اسی کتاب کو ماننے کا مدعی اور وہ گروہ بھی اسی کتاب کے ماننے کا مدعی۔ یہ بھی اسی کتاب کو پڑھ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ روشنی کا مینار اور ہدایت کا منبع و سرچشمہ ہے۔ وہ بھی اسی بات کے دعویدار ہیں لیکن حال یہ ہے کہ آپس میں دست و گریباں ہیں۔ یہ اُن کو کافر کہہ رہے ہیں اور وہ اِن کی تکفیر کر رہے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ اس تفرقہ بازی سے عوام (بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ) کا اعتماد دین پر سے، کتاب الٰہی پر سے اور علماء پر سے اٹھتا چلا جاتا ہے۔ یہ پس منظر ہے۔ دو جماعتیں دعوتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے موقع پر موجود تھیں۔

ایک تو مشرکین کا گروہ۔ ان کے متعلق فرمایا گیا: كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝ اے نبیؐ! آپ کی دعوتِ توحید ان مشرکین پر بہت بھاری ہے۔ یہ اتنی دور نکل گئے ہیں کہ ان کے لئے لوٹنا آسان نہیں ہے ان میں سے اللہ ہی جس کو چاہے گا اس دعوتِ توحید کے لئے چن لے گا اور اپنے دین کی طرف کھینچ لے گا۔ اور جن کے دل میں تھوڑی سی بھی انابت ہے وہ جلد یا بدیر آپ کے حلقۂ شامل ہو جائیں گے ـــــ رہا دوسرا گروہ اہل کتاب کا گروہ ان کے متعلق حضورؐ کو جو فکر لاحق ہو رہی تھی کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لا رہے ہیں تو اس کا ازالہ اس آیت میں فرما دیا گیا: وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ ـــــ اے نبیؐ! آپ تو پھر بھی ایک نئی کتاب لے کر آئے ہیں۔ آپؐ کی دعوتِ نبوت ان کے لئے نئی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو تو یہ بھی مانتے ہیں اور وہ بھی۔ پھر بھی ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں ـــــ اور تو اور خود بھی فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کی کاٹ میں لگے رہتے ہیں۔ تو جو اتنے انانیت پرست ہیں کہ ایک کتاب کے ماننے کے باوجود متفرق ہیں وہ آپؐ کی بات کیسے تسلیم کر لیں گے۔! یہی بات علامہ اقبالؒ نے جوابِ شکوہ میں ہمارے لئے کہی ہے ؎

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک　　　ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک　　　کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں!
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

ہماری فرقہ بندی کس سے پوشیدہ ہے۔ نہ معلوم کتنے فرقوں میں ہم بٹے ہوئے ہیں اِس کے نزدیک وہ کافر، اُس کے نزدیک یہ کافر۔ اس کے سوا کوئی اور بحث سننے میں نہیں آتی۔ اِلّا ماشاء اللہ!

لہٰذا حضورؐ کو تسلی دی جارہی ہے کہ اللہ آپؐ کے لئے راستہ نکالے گا لیکن آپؐ ان سے توقع نہ رکھئے کہ چونکہ یہ تو کتابوں کو جاننے والے ہیں۔ توحید کو ماننے والے ہیں۔ ان کے یہاں بڑے بڑے علماء ہیں۔ لہٰذا یہ تو فوراً مان لیں گے۔ لیکن نہیں ان کی انانیت ان کی راہ کا وہ پتھر ہے جو کسی طرح بھی انہیں آگے نہیں بڑھنے دے گا بلکہ یہی آپؐ کی دشمنی میں سب سے آگے ہوں گے: لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ

— اب ان حالات اور اس پس منظر میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا کرنا ہے! اس کا ذکر اگلی آیت میں آرہا ہے۔ قرآن مجید کی یہ بڑی عجیب آیت ہے۔ عجیب کے لفظ سے کہیں آپ اور کوئی مفہوم نہ لے لیں۔ عربی میں عجیب کے معنی ہیں۔ بہت دلکش، بڑی پیاری، دل کو لبھانے والی بات، ہمارے ہاں عجیب و غریب کے مفہوم میں حیرت کا جو مفہوم پایا جاتا ہے اسے اپنے ذہن سے نکال دیجئے۔

انوکھا ایمان

اس لفظ عجیب پر مجھے ایک حدیث یاد آگئی۔ تصوّر کیجئے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان جلوہ افروز ہیں — آپؐ صحابہؓ سے سوال فرماتے ہیں کہ "تمہارے نزدیک سب سے زیادہ اعجب ایمان کس کا ہے؟" — یہ بھی حضورؐ کی تعلیم و تربیت کا ایک انداز ہے —! اعجب ہے عجیب کا اسم تفضیل۔ حضورؐ صحابہؓ سے دریافت فرمارہے ہیں کہ یہ بتاؤ کہ تمہارے خیال میں سب سے زیادہ پیارا، سب سے زیادہ دلکش ایمان کس کا ہے! صحابہؓ نے کہا فرشتوں کا۔ حضورؐ نے فرمایا: وَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ وَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ "وہ کیسے ایمان نہیں لائیں گے وہ تو اپنے رب کے پاس ہیں"۔ یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات ان کے لئے غیب میں ہوتے ہوئے بھی مشہود ہے — وہ ہر لحہ اور ہر آن تجلیات ربانی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ احکام الٰہی ان کے پاس براہ راست آتے ہیں، جن کی وہ تنفیذ کرتے ہیں۔ ان کی نگاہوں کے سامنے حقائق منکشف ہیں۔ وہ ایمان رکھتے ہیں تو کون سا کمال کرتے ہیں! اگر ابوجہل کے سامنے بھی جہنم لے آئی جائے تو وہ فوراً ایمان لے آئے گا۔ لہٰذا ان کے ایمان کے اعجب ہونے

کا کوئی سوال نہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا "فالانبیاء" پھر نبیوں کا ایمان! تو حضورؐ نے فرمایا: وَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ وَالْوَحْيُ يَنْزِلُ عَلَيْهِمْ " وہ کیسے ایمان نہیں لائیں گے جبکہ وحی ان پر نازل ہوتی ہے" یعنی انبیاء پر اللہ کا فرشتہ وحی لے کر آتا ہے۔ انہیں غیب کی خبریں دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی نشانیوں میں سے کچھ نشانیوں کا انؐ کو مشاہدہ کراتا ہے۔ لہٰذا ان کا ایمان عجیب کیسے ہوگا! تیسری بار صحابہ کرامؓ نے ڈرتے ڈرتے ہوئے عرض کیا: نَحْنُ۔ "پھر ہم ہیں" ہمارا ایمان ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ وَأَنَا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ. "تم کیسے ایمان نہ لاتے جب کہ میں تمہارے مابین موجود ہوں" اب نبی اکرمؐ نے خود جواب دیا۔ اصل بات جو سمجھانا مقصود تھی وہ یہ کہ إِنَّ أَعْجَبَ الْخَلْقِ إِلَيَّ إِيمَانًا يَأْتُونَ مِنْ بَعْدِي يَجِدُونَ صُحُفًا فِيهِ كِتَابُ اللهِ فَيُؤْمِنُونَ بِمَا فِيهَا "میرے نزدیک سب سے زیادہ دلکش ایمان والے وہ ہوں گے جو میرے بعد آئیں گے۔ ان کو تو اوراق ملیں گے جن میں اللہ کی کتاب درج ہوگی۔ اور وہ اس پر ایمان لائیں گے!" یہ لوگ ہوں گے جن کا ایمان اعجب ہوگا۔ سب سے دلکش ہوگا۔ اس مقام پر ایک اہم بات سمجھ لیجئے۔ یہاں افضلیت کی بات نہیں ہو رہی۔ دلکش ہونے کی بات ہے۔ افضل ایمان صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا ہے پوری امت میں۔ ادنیٰ سے ادنیٰ صحابیؓ کا ایمان بھی بڑے سے بڑے ولی اللہ سے افضل ہے۔ یہاں میں نے سمجھانے کے لئے ادنیٰ استعمال کیا ہے ورنہ کسی صحابی کے لئے بھی ادنیٰ کا لفظ مناسب نہیں ہے۔ لہٰذا یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ افضلیت بالکل جدا بات ہے اور یہ شرف صرف صحابہ کرامؓ کو حاصل ہے۔ ایمان کا پیارا ہونا۔ دلکش ہونا بالکل دوسری بات ہے۔ اس کو (CONFUSE) نہ کر لیجئے گا۔ صحابہ کرامؓ کے درمیان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس موجود تھے۔ آپؐ خود اپنی ذات میں ایک معجزہ ہیں، عظیم ترین معجزہ، لہٰذا انؓ کے لئے ایمان لانا آسان تھا ان کی بہ نسبت جو بعد میں آئیں گے اور جو نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیضیاب ہوئے اور نہ جنہوں نے آں جنابؐ کے چہرۂ انور کا دیدار کیا۔ اور وہ قرآن مجید کے منبع، سرچشمہ اور نور سے ایمان اخذ کر رہے ہیں تو دلکش ایمان ان کا ہے۔ اس معنی میں، میں نے کہا تھا کہ اگلی آیت نمبر ۵ بڑی دلکش آیت ہے۔

نبی اکرمؐ کی رسالت کا فرضِ منصبی: دعوت اور قیامِ عدل

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے خطاب ہو رہا ہے۔ طویل آیت ہے اور اس میں نہایت اہم مضامین جامعیت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ لہٰذا میں آیت کی حصّوں میں تشریح و توضیح کروں گا۔ پہلا حصّہ ہے:

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ: "اے محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) پس آپؐ اسی کی دعوت دیتے رہیے"

اب آیت کے اس حصّے کو سمجھنے کے لئے میری کل کی تقریر پس منظر میں لے آیئے۔ میں نے توحید کی دو شاخیں بیان کی تھیں۔ پہلی توحید علمی یا نظری یا توحید فی المعرفۃ یا توحید فی العقیدہ ــــ دوسری توحید عملی۔ پھر اس توحید عملی کی بھی دو شاخیں ہیں۔ ایک توحید انفرادی و ذاتی۔ دوسری توحید اجتماعی ــــ ذاتی و انفرادی توحید یہ ہے کہ "اللہ ہی کی بندگی اور پرستش کرو اپنی اطاعت کو اسی کے لئے خالص کرتے ہوئے: فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ " آگاہ رہو اللہ کے لئے تو خالص دین ہی ہے"۔ آپ نے انفرادی سطح پر یہ کر لیا تو آپ کی ذات کی حد تک عملی توحید نافذ ہو گئی۔ اب عملی توحید کی دوسری منزل ہے کہ اجتماعی نظام پر بھی اس کو قائم اور نافذ کرو۔ پورا نظام زندگی اس کا مظہر بن جائے کہ لِيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ــــ یہ ہو گی توحید اجتماعی، یہی اقامت دین ہے۔ اسی کا حکم سورہ شوریٰ کی زیرِ درس پہلی آیت میں آچکا ہے: اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۝ ــــ توحیدِ عملی کے انفرادیت سے اجتماعیت تک پیش رفت کے مابین نقطۂ ماسکہ (LINK) کیا ہے؟ وہ ہے دعوت ــــ ایک فرد نے ذاتی طور پر توحید اختیار کی تو فطری تقاضا یہ ہو گا کہ وہ اس کی طرف دوسروں کو بلائے ــــ دوسروں کو دعوت دے۔ ان کو بھی توحید کی طرف راغب کرے۔ انہیں بھی اللہ کی بندگی کی طرف پکارے۔ پھر جو اس دعوت پر لبیک کہیں ان کو وہ مجتمع کرے۔ ان کو منظم کرے۔ ان کی تربیت کرے۔ یہاں دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کے تین مراحل کا ذکر آگیا[1]۔ پھر اس کے لئے لازم ہو گا وہ ان تین مراحل سے گزر کر ایک طاقت فراہم کرے

---

[1] دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کے انقلابی پہلو اور ان کے جملہ مراحل کی تفہیم کے لئے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اور نظام باطل کو تلپٹ کر کے رکھ دے۔ اسے بیخ و بن سے اکھیڑ کر دین اللہ کو قائم کر دے۔ تاکہ اجتماعی توحید کی تکمیل ہو جائے۔ اب انفرادی توحید اور اجتماعی توحید کے درمیان ...... کیا ہے؟ نقطۂ ماسکہ کیا ہے؟ وہ ہے دعوت۔ سورہ حٰم السجدہ کی آیت نمبر ۳۳ کو ذہن میں رکھئے جس کا ذکر میری کل کی تقریر میں آچکا ہے: وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ▪ اور یہاں فرمایا: فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ یہاں کلمہ "فا" اور "لام غایت" نے ذٰلِكَ سے مل کر اس آیت کو ماسبق آیات سے بھی مربوط کر دیا ہے اور اس پس منظر سے بھی جو اس پوری سورۂ شوریٰ کے نزول کے وقت موجود تھا جس کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ اس دعوت کا ہدف کیا ہوگا! وہ ہوگا اقامتِ دین: اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۔۔۔ اے نبیؐ! اسی کی دعوت دیجئے کہ اللہ کے دین کو قائم کرو، نافذ کرو، برپا کرو، مجتمع و منظم ہو جاؤ، باطل سے ٹکراؤ اور اس تصادم کے لئے خود کو قربانی اور ایثار کے لئے تیار کرو۔ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ کی یہ ہوئی تشریح و توضیح

استقامت کا حکم

آگے چلئے فرمایا: وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ " اور ڈٹے رہیئے جمے رہیئے جس کا آپ کو حکم ہوا ہے"۔ آپ کو کیا حکم ہوا تھا۔ وہ قدرے تفصیل سے میری کل کی تقریر میں بیان ہو چکا ہے۔ آج بھی اس کا حوالہ آیا ہے۔ اس کا پھر اعادہ کر لیجئے۔ وہ حکم یہ تھا فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ط۔ پھر کیا حکم ہوا تھا! قُلْ اِنِّىْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ط۔ پھر کیا حکم ہوا: قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِيْنِىْ ط کہہ دیجئے اے محمدؐ! (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے تو یہ حکم ہوا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے فرمان کے سامنے سر جھکاؤں۔ سب سے پہلے میں اس کا فرمانبردار بنوں۔ اور کہہ دیجئے کہ میں تو اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے اسی کی عبادت کرتا ہوں اور کروں گا ۔۔۔ یہاں انشائیہ اسلوب میں آپؐ سے فرمایا جا رہا ہے: وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ پس آپؐ ڈٹے رہیئے، مستقیم رہیئے اس پر جو آپؐ کو حکم ہوا ہے۔۔۔ یعنی مخالفت تو ہے۔ کوئی

(مسلسل) محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اس درس قرآن اور خطاب کا مطالعہ ان شاء اللہ نہایت مفید رہے گا۔ جو حال ہی میں "مسلمانوں کے فرائض دینی اور اسوۂ رسولؐ" کے نام سے کتابی شکل میں منصۂ شہود پر آیا ہے۔ (مرتب)

شک نہیں۔ دباؤ پڑ رہا ہے کوئی شک نہیں۔ آپ کے لئے مصائب کے بڑے بڑے طوفان آتے نظر آرہے ہیں، یہ سب صحیح ہے لیکن آپ نے کھڑے رہنا ہے اور جمے رہنا ہے۔
آپ مکی دور کی سورتوں کو دیکھیں گے تو اس استقامت کے لئے آپ کو نظر آئے گا کہ آنحضورؐ کو بار بار صبر کی تلقین و وصیت کی جارہی ہے اور آں جنابؐ کے توسط سے یہ تلقین اہل ایمان کو بھی ہورہی ہے۔ سورۂ مدثر میں فرمایا گیا: وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ "اے محمدؐ! اپنے رب کے راستے کی دعوت میں پیش آنیوالی مشکلات پر صبر کیجئے" سورۂ احقاف میں فرمایا گیا: فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ "صبر کیجئے اے محمدؐ! (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے ہمارے اولوالعزم پیغمبر صبر کرتے آئے ہیں" سورۂ نحل میں فرمایا گیا: وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ "اے محمدؐ! صبر کیجئے اور آپ کا سہارا بس اللہ ہی ہے" یعنی صبر کے لئے بھی کوئی سہارا درکار ہے تو آپؐ کا سہارا ہم خود ہیں۔ آپؐ کے صبر کی بنیاد ہم سے تعلق اور محبت ہے ــــ سورۂ قلم میں فرمایا گیا: فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ "(اے محمدؐ!) پس صبر کیجئے اپنے رب کے حکم کا انتظار کیجئے مچھلی والے کی طرح نہ ہو جائیے گا"۔ یہاں صاحب الحوت سے مراد حضرت یونس علیہ السلام ہیں۔ انہوں نے ذرا جلدی کی تھی۔ عجلت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ معاذاللہ کسی گناہ کا کوئی سوال نہیں، کسی نبی سے کسی گناہ کا صدور نہیں ہوسکتا۔ ہوا یہ تھا کہ دین کی حمیت و غیرت اتنی غالب آگئی کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کا انتظار کئے بغیر اپنی قوم سے ان کے کفر پر اڑے رہنے کے باعث متنفر اور مایوس ہو کر اس قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ یہاں یہ فرمایا گیا کہ ایسا نہ کیجئے گا۔
سورۂ مزمل میں فرمایا گیا: وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا "اے نبیؐ! صبر کیجئے اس پر جو کچھ یہ مشرکین کہہ رہے ہیں اور ان سے بہتر اور احسن طریق سے کنارہ کشی اختیار کیجئے"۔ نقل کفر کفر نہ باشد، دعوتِ توحید پیش کرنے کے نتیجے میں مشرکین میں سے کوئی پاگل کہہ رہا ہے، کوئی کہہ رہا ہے کہ دماغ خراب ہوگیا ہے، کوئی شاعر کہہ رہا ہے، کوئی ساحر کہہ رہا ہے اور کوئی کہہ رہا ہے کہ ساحر نہیں بلکہ مسحور ہیں، ان پر کسی نے جادو کر رکھا ہے۔ یہ اس جادو کے زیر اثر ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ بھی نہیں ہے آسیب زدہ ہیں ان پر کوئی جن آگیا ہے یہ مجنون ہیں۔ یہ ساری باتیں سن رہے ہیں جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور حکم ہو رہا ہے کہ صبر کیجئے اس پر کہ جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں: وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ ○
ــــ پھر آنحضورؐ کو تسلی اور تشفی بھی دی جارہی ہے۔ سورۂ قلم میں فرمایا گیا: نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ○ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ○ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ○ وَاِنَّكَ لَعَلٰى

خُلُقٍ عَظِیۡمٍ ■ " ن۔ قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں آپؐ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں۔ اور یقیناً آپؐ کے لئے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے اور (اے نبیؐ!) تحقیق آپؐ اخلاق کے اعلیٰ ترین مرتبہ پر فائز ہیں"۔۔۔۔ لہٰذا ان مشرکین کی باتوں کا اثر نہ لیجئے۔

یہ ہے سارا پس منظر جس میں حضورؐ سے فرمایا جارہا ہے: وَاسۡتَقِمۡ کَمَاۤ اُمِرۡتَ ج۔۔۔ دباؤ کتنا ہی سخت ہو، مخالفت کتنی ہی شدید ہو، استہزا اور تمسخر کتنا ہی دل آزار اور اذیت ناک ہو، حالات کتنے ہی ناموافق و نامساعد ہوں ماحول کتنا ہی ناسازگار ہو، اے نبیؐ! آپؐ کو عبادتِ ربّ، دعوت الی اللہ اور اقامتِ دین کی جدوجہد اور جہد وجہاد کا جو حکم ہوا ہے، اس پر جمے رہیئے ■ ڈٹے رہیئے۔ نوٹ کیجئے گا کہ سورہ حٰمٓ السجدہ کی جو آیت دعوت الی اللہ کے ضمن میں، میں نے کل آپ کو سنائی تھی، اس سے دو آیات پہلے والی آیت نمبر ۳۰ میں استقامت کا ذکر آچکا ہے۔ فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ۝ میں کہا کرتا ہوں کہ اس لفظ استقامت میں قیامت پوشیدہ اور مضمر ہے۔ کہو کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اس پر چٹان کی مانند جم جاؤ۔ اب کوئی طوفان کتنا ہی سخت اور شدید آئے تمہارے قدموں میں جنبش اور لغزش پیدا نہ کرسکے۔ لہٰذا قولی اور عملی ہر نوع کی مخالفت کو اے محمدؐ! آپؐ جھیلئے۔ وَاسۡتَقِمۡ کَمَاۤ اُمِرۡتَ ج۔

مصالحانہ رویہ کی ممانعت

اس آیت کا اگلا حصہ ہے، فرمایا:

وَلَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَہُمۡ ج

"اور (اے نبیؐ!) ان (مشرکوں اور کافروں) کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے!"

دباؤ کی ایک صورت یہ بھی ہوئی ہے کہ قریش کے مشرک سرداروں نے جب یہ محسوس کیا کہ دعوت توحید کو روکنے میں ہر نوع کے استہزاء و تمسخر اور شدید جور و ستم کے باوجود ان کی کوششیں کامیاب نہیں ہو رہیں اور وہ نہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوتِ توحید سے روک سکے ہیں نہ ان کے مظالم سعید لوگوں کو دعوت قبول کرنے سے باز رکھ سکے اور نہ ہی دعوت قبول کرنے والے کسی شخص کو مصائب سے ہراساں کرکے دین چھوڑنے پر آمادہ کرسکے تو مشرکین کی طرف سے نبی اکرمؐ کے پاس سفارتیں اور پیشکشیں آنی شروع ہوگئیں اور آپؐ کے سامنے مصالحت کا یہ فارمولا پیش کیا جانے لگا

کہ کچھ ہم آپ ﷺ کی بات مان لیتے ہیں کچھ آپ ہماری بات مان لیں۔ سورۂ قلم میں آغاز ہی میں یہ فرمادیا گیا تھا کہ : فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ ٥ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ ٥ "پس اے نبی ﷺ! آپ ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آئیں یہ تو چاہتے ہیں کہ آپ کچھ ڈھیلے پڑیں، کچھ مداہنت کریں تو یہ بھی ڈھیلے پڑیں اور مداہنت کا رویہ اختیار کرلیں" انہوں نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ آپ ﷺ کے قدموں میں ذرا بھی لغزش نہیں آئی یہ پورا زور لگا کر بھی ان کو پیچھے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اب یہ چاہتے ہیں کہ مصالحت ہو جائے، کچھ مان لیجئے کچھ منوا لیجئے (GIVE & TAKE) کا معاملہ کیجئے۔ کچھ دیجئے کچھ لیجئے۔ ہماری بھی تو ناک رہ جائے۔ ہماری بھی کچھ عزت رہ جائے۔ ساری کی ساری بات آپ کی مان لی جائے یہ ممکن نہیں ہے۔ آپ ﷺ کو پیشکش کی گئی کہ اگر اس دعوت توحید کے ذریعے آپ کو دولت درکار ہے تو اشارہ کر دیجئے ہم دولت کے انبار آپ ﷺ کے قدموں میں لگا دیں گے۔ اگر آپ اقتدار چاہتے ہوں تو ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنانے کے لئے تیار ہیں۔ اگر آپ ﷺ کسی خاص خاتون سے نکاح کرنے کی خواہش رکھتے ہوں تو اشارہ کر دیجئے وہاں نکاح ہو جائے گا۔ یہ ہوتا ہے دامِ ہم رنگِ زمیں۔ اللہ کی طرف بلانے والا اللہ کا بندہ شدید مشکلات اور مصائب میں گھرا ہوا ہے۔ حالات اتنے نامساعد اور ناموافق ہیں کہ بظاہر کہیں راستہ نکلتا نظر نہیں آرہا۔ ان حالات کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے جس سے اس وقت آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان دوچار ہیں۔ اس وقت ایسی ایسی پیشکشیں آتی ہیں تو نفس تو کہتا ہے کہ قبول کر لو۔ چلو اس وقت یہ سو فی صد نہیں مانتے، پچاس فی صد ماننے کے لئے تیار ہیں، اسی کو غنیمت سمجھ کر مصالحت کر لی جائے۔ رفتہ رفتہ ان کو رام کر لیا جائے گا اور پورے دین پر عمل پیرا ہونے کے لئے ان کو آمادہ کر لیا جائے گا۔ لیکن حکم یہ دیا جا رہا ہے کہ نہیں۔ ڈٹے رہئے دین کُل کا کُل قبول کریں تو ٹھیک ہے۔ جزوی دین، دین ہے ہی نہیں۔ اسی لئے یہاں فرمایا گیا : وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ۚ ان ہی احکام الٰہی کے پیش نظر مشرکین کی دامِ ہم رنگِ زمیں پیشکشوں اور قتل کرنے کی دھمکیوں کے جواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے جو تاریخ میں آب زر سے لکھے جائیں تو بھی اس جواب کی شان کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ آپ ﷺ نے مشرکین کو جواب دیا:

"اگر تم میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دو تب بھی میں اس دعوت سے باز نہیں آسکتا۔ یا تو میں اس دعوت کی تبلیغ میں اپنی جان دیدوں گا

یا اللہ اس کو کامیابی سے ہمکنار فرمائے گا؟"
یہ بھی اس حکم کی عمل اور قول میں تعمیل کہ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ علامہ اقبال نے اس بات کو بڑی خوبصورتی سے اس شعر میں ادا کیا ہے ؎

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

نوٹ کیجئے کہ یہی صورت حال مدینہ منورہ میں بھی پیش آ گئی تھی۔ وہاں بھی یہود کے علماء کا مطالبہ یہی تھا کہ کچھ لیجئے کچھ دیجئے۔ کچھ ہماری باتیں مانئے کچھ ہم آپؐ کی باتیں مان لیں گے۔ اسی پس منظر میں سورۂ بقرہ میں جو مدنی سورت ہے فرمایا گیا۔ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ۔ اے نبیؐ! یہ یہود و نصاریٰ آپؐ سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک آپؐ ان کی ملت (طور طریقوں) کا اتباع نہ کریں!" یہ تو اپنے تعصب اور اپنی عصبیت کی وجہ سے اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔ یہ آپؐ سے کبھی راضی نہ ہوں گے۔ آپؐ اگر انہیں کچھ رعائتیں دینے پر آمادہ ہو جائیں تب بھی یہ آپؐ کی بات نہیں مانیں گے۔ اصل مسئلہ تو ہے دینی قیادت کا۔ آپؐ ان کے پیچھے چلیں تب یہ خوش ہوں گے۔ یہ اہل کتاب اچھی طرح جانتے تھے کہ آپؐ بحیثیت رسول دین کے معاملہ میں کسی مصالحت کے لئے تیار ہی نہیں ہو سکتے تھے اس لئے ان کی مصالحانہ پیش کش بھی اخلاص و خلوص پر مبنی نہیں ہوتی تھی بلکہ اس لئے ہوتی تھی کہ اپنے عوام اور حلقۂ اثر کو یہ مغالطہ دیں کہ ہم تو مصالحت کی برابر کوشش اور پیش کش کر رہے ہیں لیکن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی اپنے موقف پر بضد ہیں۔ قرآن حکیم نے ان اہل کتاب کے نفاق کو مختلف اسالیب سے فاش کیا ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۸۵ طویل آیتوں میں سے ایک ہے۔ اس میں پہلے تو ان اہل کتاب کے اُن جرائم کا ذکر کیا گیا ہے جو وہ اپنی کتاب اور اپنی شریعت کی خلاف ورزیوں کے طور پر کرتے تھے۔ جو کام خود ان کی شریعت میں حرام تھے ان کا ارتکاب کرتے تھے پھر بھی اس بات کے دعوے دار تھے کہ ہم شریعت موسوی پر کاربند ہیں۔ اس پر کامل ایمان رکھتے ہیں ـــــ ان کے چند جرائم گنوا کر فرمایا گیا:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ	"تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان
وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا	لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر
جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ	کرتے ہو! پھر تم میں سے جو لوگ

إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ إِلٰى أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

ایسا کریں، ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں۔ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔"

آیت کا یہ حصہ یہود کے اس طرزِ عمل کی مکمل عکاسی ہے جو انہوں نے اللہ کی شریعت کو حصوں میں تقسیم کر کے اختیار کیا ہوا تھا۔ وہ اس جرم کا ارتکاب کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کے کچھ حصوں پر عمل کرتے تھے۔ اور کچھ حصوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ یا ان کے بالکل خلاف عمل کرتے تھے۔ گویا ان کی اطاعت اخلاص و خلوص سے خالی تھی۔ اس میں ملاوٹ شامل ہو گئی تھی۔ اس میں نفس کی چاہت اور خواہشات کی پیروی کی آمیزش ہو گئی تھی۔ اس طرزِ عمل پر آیت کے اس حصے میں جو سخت وعید آئی ہے وہ لرزا دینے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دین و شریعت کے ساتھ جو بھی یہ معاملہ کرے گا کہ ایک طرف اللہ کی توحید، اس کی کتاب اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لانے کا دعویٰ ہو، دوسری طرف اس کے دین اور اس کی شریعت کے ساتھ یہ معاملہ ہو کہ کچھ حصے پر عمل ہو اور کچھ حصہ کو چھوڑ دیا جائے یا اس کے برخلاف عمل کیا جائے تو اس امت کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ وہی معاملہ کرے گا جو سابقہ امت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ وَلَا تَجِدُ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا○ اور وَلَا تَجِدُ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا○ آج ہم بحیثیت امت دنیا میں ذلیل و خوار ہیں۔ ہمارا کوئی وقار نہیں، ہماری کوئی وقعت نہیں۔ یہ نقد سزا ہے جو ہم کو دنیا میں مل رہی ہے اس جرم کی کہ ہم نے بھی یہود کی طرح دین و شریعت کو اجزاء میں تقسیم کر رکھا ہے۔ مسجدوں میں تو اللہ کا حکم چلے اور عدالتوں میں، اسمبلیوں میں، معاشیات میں، معاشرت میں، ملک کے مجموعی اور اجتماعی نظام میں اللہ کے احکام بے دخل رہیں ـــــ ان چند جملہ ہائے معترضہ کے بعد اصل مضمون کی طرف آیئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جا رہا ہے کہ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ اور منع فرمایا جا رہا ہے کہ ان منکرینِ حق کی خواہشات کی ہرگز پیروی نہ کیجئے گا۔ دراصل اس اسلوب میں ان کفار اور مشرکین کو متنبہ کرنا مقصود ہے کہ تم ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے یہ توقعات نہ رکھو کہ وہ تمہاری خواہشات کی پیروی کریں گے۔ یہ سب مفاہیم و معانی

آیت کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں سموئے ہوئے ہیں کہ: وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ؟

ایمان بالکتاب

آگے چلیے اور قرآن مجید کا یہ اعجاز دیکھیے کہ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں نہایت جامعیت کے ساتھ نہایت اہم مضامین و موضوعات کا احاطہ کر لیتا ہے۔ کوزے میں سمندر بند کرنے کا محاورہ اگر صد فی صد راست آتا ہے تو وہ قرآن مجید کی ہر آیت پر راست آتا ہے۔ ــــ اب اسی آیت کا اگلا حصہ پڑھیے اور دیکھیے کہ ایک بات ڈنکے کی چوٹ کہنے کا نبی اکرمؐ کو حکم ہو رہا ہے۔ فرمایا:

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ج

"اور (اے نبیؐ!) کہہ دیجئے کہ میں تو ایمان رکھتا ہوں اس کتاب پر جو اللہ نے نازل کی ہے"

یہاں توقف کر کے پہلے "مِنْ كِتٰبٍ" کی کچھ شرح سمجھ لیجئے۔ تفصیل کے لئے وقت نہیں لہٰذا اشارات ہی پر اکتفا کرنا پڑے گا۔ یہاں "مِنْ كِتٰبٍ" فرما کر یہ بات واضح کی گئی ہے کہ نبی اکرمؐ صرف قرآن کریم ہی کو منزّل من اللہ تسلیم نہیں فرماتے تھے بلکہ ہر آسمانی کتاب کو ماننے کا اقرار فرماتے تھے۔ اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ۔ الم۔ اسی بات کو سورۂ بقرہ کے آخری رکوع میں اس طرح واضح فرمایا گیا ہے: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ "ہمارے یہ رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس ہدایت یعنی قرآن پر ایمان لائے ہیں جو ان کے رب کی جانب سے ان پر نازل کی گئی ہے اور وہ بھی ایمان رکھتے ہیں جنہوں نے ہمارے رسولؐ کی تصدیق کی ہے۔ یہ سب اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی طرف سے نازل کردہ تمام کتابوں پر اور اس کی طرف سے مبعوث کئے جانے والے تمام رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں" ــــ اور ہمارے رسولؐ اور ان کے اصحاب کا قول یہ ہے: لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ "ہم اللہ کے رسولوں کے مابین تفریق نہیں کرتے"۔ مطلب یہ ہوا کہ تورات، زبور، انجیل اور دوسرے صحیفے جو بھی اللہ کی طرف سے نازل ہوئے ان سب پر بھی اور قرآن پر بھی ہر مسلمان کا ایمان ہے۔ قرآن مجید درحقیقت تمام آسمانی کتابوں کا مہیمن و مصدّق ہے۔ پہلی کتابیں محرّف ہوگئیں، صحیفے گم ہوگئے۔ قرآن ان سب کا جامع ہے اور تاقیامِ قیامت محفوظ رہے گا۔ چونکہ حضورؐ خاتم النبیین والمرسلین

ہیں۔ اسی طرح اللہ کے تمام رسولوں کی خاتم النبیین والمرسلین بھی اور آپ کے صحابیؓ بھی تصدیق کرتے ہیں ــــ اب آئیے آیت کے اس حصے کی طرف۔ آپ نے دیکھا کہ آیت نمبر میں لفظ کتاب آچکا ہے: وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ۔ بظاہر یہ کتاب کے ماننے والے ہیں، بظاہر یہ اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا ایمان تورات پر ہے۔ لیکن ان کا یقین متزلزل ہو چکا ہے اپنے دینی سربراہوں کا کردار دیکھ کر ان کے رویہ کو دیکھ کر، ان کے تفرقے کو دیکھ کر ان کتابوں پر سے ان کا اعتماد اٹھ چکا ہے۔ ان کا ایمان ہل چکا ہے۔ اس کے مقابلے میں یہاں نبی اکرمؐ کی زبان سے کیا کہلوایا جا رہا ہے۔! یہ کہ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ "میرا ایمان تو اس کتاب پر ہے جو اللہ نے نازل فرمائی ہے اور میرا سارا عمل اس کے مطابق ہے۔ میں تو اس پر جما ہوا ہوں ــــ

قرآن میں تبدیلی کا مطالبہ سورۂ یونس میں مشرکین کے اس مطالبہ کا حوالہ آیا ہے۔ جو وہ قرآن میں تغیر و تبدل کے لئے کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر یہ ہو جائے تو ہماری اور آپ کی صلح ہو سکتی ہے۔ سورۂ یونس میں فرمایا: وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ "اور جب انہیں ہماری روشن اور بیّن آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو آخرت میں ہم سے ملنے کا یقین نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لاؤ یا اسی میں رد و بدل کر دو،" ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ قرآن بہت (RIGID) ہے۔ یہ بالکل بے لچک ہے۔ اس کا موقف بہت سخت ہے۔ آخر دوسروں کو بھی (ACCOMODATE) کیا جانا چاہیئے۔ مصالحانہ رویہ (COMPROMISING ATTITUDE) بھی تو ہونا چاہیئے۔ لہٰذا کوئی دوسرا قرآن لاؤ یا پھر اسی میں تغیر و تبدل کرو ــــ کچھ اس کی سختی کم کرو اور اسے نرم بناؤ۔ ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ ــــ جواب کیا دلوایا گیا۔

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ	"اے نبیؐ! کہہ دیجئے کہ میرے لئے یہ
مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ	ممکن ہی نہیں کہ میں اپنے جی سے اس میں
اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ	کوئی تغیر و تبدل کر دوں۔ میں تو خود اسی

اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ○ (آیت ۱۵) کے اتباع پر مامور ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے ہولناک عذاب کا خوف ہے۔"

"یعنی اگر یہ باتیں میں اپنے جی سے کہہ رہا ہوتا۔ یہ میرے اپنے نظریات ہوتے۔ میرا اپنا کوئی پروگرام ہوتا۔ کوئی پارٹی منشور ہوتا جس کو چند لوگوں کی مشاورت سے بنایا گیا ہوتا تو میں اس میں ترمیم و تنسیخ کرسکتا تھا۔ کوئی ردّ و بدل ہوسکتا تھا۔ لیکن یہ اللہ کا کلام ہے اس کے فرامین ہیں جو میں تمہیں پڑھ کر سُنا رہا ہوں"۔ میں آپ کو کل کی تقریر میں سورہ زمر کی یہ آیت سنا چکا ہوں: وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَکُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ ○ مجھے تو حکم ملا ہے کہ اللہ کا پہلا فرمانبردار میں خود بنوں۔ چنانچہ اللہ کے احکام کے سامنے سر جھکانے والا اور اس کی تابعداری کرنے والا سب سے پہلے میں خود ہوں۔ اس لئے میرے لئے یہ کہاں ممکن ہے کہ قرآن مجید میں کوئی تبدیلی کرسکوں۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ ___ یہی تو بات تھی کہ اسی سورۃ زمر کے آخر میں کس قدر جلالی انداز ہے کہ: قُلْ اَفَغَیْرَ اللّٰہِ تَاْمُرُوْنِّیْٓ اَعْبُدُ اَیُّھَا الْجٰھِلُوْنَ ○ اے نبی! کہہ دیجئے کہ جاہلو! کیا تم مجھے بھی حکم اور مشورہ دے رہے ہو کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی اور پرستش شروع کر دوں۔ اے حرص و ہوا کے بندو! مجھے اپنے اوپر قیاس نہ کرو۔ مجھے مصلحتوں کے راستے نہ دکھاؤ۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ کی بندگی کے سوا کوئی اور راستہ اختیار کروں۔ مجھے تو حکم ملا ہے: بَلِ اللّٰہَ فَاعْبُدْ وَکُنْ مِّنَ الشّٰکِرِیْنَ ■ میں اللہ ہی کی بندگی اور پرستش کرتا رہوں اور اس کے شکر گزار بندوں میں شامل رہوں۔ وہی حکم یہاں ہے کہ: قُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنْ کِتٰبٍ؟

نظامِ عدل و قسط کا قیام

اب آگے اس آیت کریمہ کا نہایت ہی اہم حصّہ آرہا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ سورہ شوریٰ کی آیت ۱۵ طویل آیات میں سے ایک ہے اور اس آیت کے ہر حصّہ میں معانی و مفاہیم کے سمندر پنہاں ہیں۔ اب اگلے حصّہ پر توجہات کو مرتکز کیجئے فرمایا:

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ ط

"اور مجھے حکم ملا ہے کہ تمہارے مابین عدل قائم کردوں"

یہ حصّہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی صحیح تفسیر و تعبیر

یہ ہے کہ "دینُ اللہ" درحقیقت اجتماعی نظامِ عدل وقسط ہے ۔ دینُ اللہ قائم کرنے کا مقصد کیا ہے! وہ یہ ہے کہ انسانوں کے مابین عدل وقسط اور انصاف کا نظام قائم ونافذ ہو ۔ تمدّن کی جو بھی پیچیدگیاں اور اونچ نیچ ہے' ان سب کو رفع کرکے ایک مبنی بر انصاف نظام قائم ہو' معاشرے کے کسی فرد کے بھی حقوق تلف نہ ہوں ۔ معاشرے کا کوئی طبقہ کسی دوسرے طبقہ کا استحصال نہ کرسکے ۔ عورت اور مرد کے درمیان توازن ہو اور مبنی بر انصاف توازن ہو ۔ سرمایہ اور محنت کے درمیان توازن ہو اور مبنی بر قسط وعدل توازن ہو ۔ فرد اور معاشرے کے درمیان توازن ہو اور یہ توازن بھی عدل و قسط پر مبنی ہو ۔ ان تمام اعتبارات سے عدل وقسط قائم کرنا ہی شریعت کا منشا و مدّعا ہے اس بات کو مزید سمجھنے کے لئے سورۂ حدید کی پچیسویں آیت دیکھئے جس کے آغاز میں فرمایا:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ "بلاشبہ اور بالتحقیق ہم نے اپنے رسولوں کو بیّنات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ عدل وقسط پر قائم ہوجائیں" قرآن حکیم کی یہ بڑی مہتم بالشان آیتوں میں سے ایک ہے ۔ اس میں رسولوں کی بعثت اور ان کو معجزات اور واضح وروشن دلائل دیئے جانے کا مقصد بھی بیان ہوا ہے اور کتب نیز ساتھ ہی میزان یعنی شریعت کے نزول کی غایت بھی واضح طور پر بیان کردی گئی ہے ۔ ان تمام کی غرض وغایت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ بنی نوع انسان عدل وقسط پر قائم ہوں ۔ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ ایک ایسا اجتماعی نظامِ حیات نافذ اور جاری وساری ہو جو مبنی بر عدل وقسط اور انصاف ہو ۔ جس پر کاربند ہوکر کوئی کسی کا خون نہ چوسے، کوئی کسی کا استحصال نہ کرے ۔ کوئی کسی کو ناجائز طور پر دبائے نہیں ۔ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے، کوئی کسی کی حق تلفی نہ کرے ۔ کوئی کسی پر جور وستم اور دست درازی نہ کرے ۔ لہٰذا صرف دین اللہ اور المیزان یعنی شریعتِ الٰہی کے ذریعے انسان کو وہ معیارِ حق وباطل مل سکتا ہے جو ٹھیک ٹھیک تول کر بتادے کہ انسانی معاشرے میں حقوق وفرائض کا توازن کیا ہے! نظریات وافکار میں حق کیا ہے! باطل کیا ہے! اخلاق ومعاشرت میں طہارت وپاکیزگی کے معیارات کیا ہیں! یہی نظام متعیّن کرتا ہے کہ عبد ومعبود کے درمیان صحیح تعلق کی اساسات کیا ہیں! اس حیاتِ دنیوی کا آخرت کی ابدی زندگی سے ربط وتعلق کیا ہے!

اظہار دین الحق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرہ نمائے عرب میں بنفسِ نفیس بالفعل دین اللہ قائم، غالب اور نافذ کر کے دکھا دیا۔ خلافتِ راشدہ میں اسی نظام عدل و قسط کے مزید خدّ و خال نمایاں ہوئے۔ اسی لئے اسے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا جاتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر جب بیعت خلافت ہوئی تو آپؓ نے جو پہلا خطبہ دیا یعنی (POLICY STATEMENT) کا اعلان کیا تو اس میں اسی عدل و قسط کے نظام کی وضاحت میں فرمایا کہ اے لوگو! میرے نزدیک تم سے ہر قوی کمزور ہوگا جب تک کہ میں اس سے حق وصول نہ کر لوں اور ہر کمزور میرے نزدیک قوی ہوگا جب تک کہ اس کا حق اسے دلوا نہ دوں ـــ پھر یاد کیجئے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس موقع پر کیا ارشاد فرمایا تھا جب اسلام کے نظام عدل و قسط کا جھنڈا عرب و عجم اور شمالی افریقہ کے وسیع علاقوں پر لہرانے لگا تھا اور اللہ کا کلمہ ہی سب سے بلند ہو گیا تھا کہ "عمر کو یہ اندیشہ مضطرب اور بے چین کئے رکھتا ہے کہ اگر کوئی کتا بھوک سے عراق میں ہلاک ہو گیا تو آخرت میں مجھ سے اس کی باز پرس ہوگی ـــ مجھ سے جواب طلبی کی جائے گی۔ جس نظام عدل و قسط میں اس کا سربراہ بھوک سے ایک کتے کے ہلاک ہو جانے پر خوفزدہ اور ہراساں رہتا ہو، اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ انسان کے حقوق کی عدل و انصاف کے ساتھ پاسداری اور ادائیگی کا اس نظام میں کیا مقام ہوگا!! ـــ یہاں ایک اور بات نوٹ کر لیجئے جس کو میں پہلے بھی اپنے دروس میں کئی بار بیان کر چکا ہوں کہ قرآن حکیم کا یہ اسلوب ہے کہ اہم مضامین کم از کم دو مرتبہ ضرور بیان ہوتے ہیں۔ سورہ حدید میں تو تمام رسولوں کے ساتھ کتابوں اور میزان کے نازل فرمانے کی غایت اور اس کا مقصد بیان فرمایا گیا کہ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ آگے آپ دیکھیں گے کہ اسی سورہ شوریٰ کی سترھویں آیت میں نبی اکرمؐ پر کتاب یعنی قرآن اور میزان یعنی شریعت کے نزول کا ذکر موجود ہے:

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ؕ [1]

---

[1] سورہ شوریٰ کی آیت زیر درس میں تو حضورؐ سے کہلوایا جا رہا ہے کہ "وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ" سورہ نساء کی آیت نمبر ۵۸ میں تمام اہل ایمان سے فرمایا گیا: وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ " (اے مسلمانو!) جب بھی تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

پس یہ دین اللہ، یہ شریعت، یہ میزان درحقیقت نظام عدل و قسط ہے۔ یہ عادلانہ و منصفانہ اجتماعی نظام ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو عطا فرماتا رہا۔ اور جس کا اکمال و اتمام ہوا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط آج (یعنی نبی اکرمؐ کے توسط سے آپؐ کے زمانہ بعثت میں) میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمل کر دیا ہے اور نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام بطور دین (نظامِ حیات) قبول کر لیا ہے"۔

کسی واعظ اور رسولؐ کی دعوت کا فرق

یہاں پر وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ کے ضمن میں ایک بات اور سمجھ لیجئے۔ یہ بھی اہم اور ضروری بات ہے۔ ایک ہوتا ہے واعظ۔ وعظ کہا اور اگلی منزل۔ اگر کوئی پیشہ ور واعظ ہے تو اس کا اصل مقصود و مطلوب یہ ہوتا ہے کہ اس کے وعظ کی دھوم ہو، اس کے زورِ خطابت کی سامعین داد دیں، جہاں جائے لوگ نعروں سے استقبال کریں۔ وہاں گلے میں ہار پڑیں عمدہ سے عمدہ کھانا ملے، بطور نذرانہ خدمت ہو جائے پھر اگلی منزل ہے۔ وہاں بھی وعظ کہا، مطلوب حاصل کیا پھر اگلی منزل ہے ___ ایک وہ ہے جو کھڑا ہو جاتا ہے اور منادی کرتا ہے کہ میں وعظ کہنے نہیں آیا نظام عدل و قسط قائم کرنے آیا ہوں۔ وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ___ اب تو زمین و آسمان کا فرق واقع ہو گیا۔ ناجائز طور سے کمائی کرنے والے اور حرام خوری کرنے والے لوگ اپنی حرام اور ناجائز طریقے سے کمائی ہوئی دولت میں سے کسی واعظ کو کچھ نذرانے کے طور پر دے دیں۔ خوب مرغن کھانا کھلا دیں، ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔ نظام وہی رہے گا، نظام پر کوئی آنچ نہیں آنی چاہیے۔ ہمارے ظالمانہ نظام، ہمارے تشدد، ہمارے استحصال، ہمارے دباؤ، ہمارے مشرکانہ یا مبتدعانہ عقائد، ہمارے جاہلیت پر مبنی رسم و رواج اور ہماری حرام خوریوں پر آنچ نہیں آنی چاہیے ___ ان پر نکیر نہ ہو، ان کو

(مسلسل) کے ساتھ کرو"۔ اسی طرح سورۃ نحل کی آیت کے آغاز میں نہایت تاکیدی اسلوب سے فرمایا گیا: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ ___ "(اے مسلمانو!) اللہ تمہیں عدل اور بھلائی کرنے کا حکم دیتا ہے"۔ (مرتب)

چیلنج نہ کیا جائے۔ نذرانے لے لو، چڑھاوے چڑھوا لو، کوئی اور خدمت ہے تو بتاؤ، حاضر ہیں۔ چندے لینے ہیں، حاضر ہیں لیکن ہمارے نظام کو مت چھیڑنا۔ لیکن جہاں بات یہ آجائے کہ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ۔ میں صرف وعظ کہنے نہیں آیا ہوں میں نظام عدل و قسط قائم کرنے آیا ہوں۔ میں مامور من اللہ ہوں۔ مجھے تو اس کا حکم ملا ہے۔ لہٰذا جو لوگوں کا طرح طرح سے خون چوس رہے ہیں وہ تو مخالفت کریں گے۔ جن کے مفادات پر زد پڑتی ہو، آنچ آتی ہو وہ کسی طور اس کو برداشت نہیں کر سکتے کہ ایک غلط اور ظالمانہ نظام کا جو ناجائز انتفاع ہے جو (VESTED INTEREST) ہے وہ ختم ہو جائے۔ یہ بات ان کے لئے ہرگز قابل قبول نہیں ہو گی۔ وہ اس سے کبھی بھی دست بردار ہونے کے لئے آمادہ نہیں ہوں گے۔ (THEY CANT TAKE IT LYING DOWN) کہ وہ آپ کو موقع دے دیں (WALK OVER) دے دیں کہ چلئے آپ نظام عدل و قسط قائم کر دیں۔ وہ تو مزاحمت کریں گے، مخالفت کریں گے، اس دعوت کو کچلنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے۔ عدل قائم کرنے کا کیا مطلب ہے! یہی کہ جن لوگوں کو ناجائز مراعات حاصل ہیں، وہ ان سے چھین لی جائیں۔ لہٰذا اب تصادم ہو گا، اب لڑائی ہو گی" اب مقابلہ ہو گا، اب حزب اللہ اور حزب الشیطان آمنے سامنے آئیں گے۔ اب مقاتلہ طے کرے گا کہ کون اپنے موقف میں سچا اور مخلص تھا۔ کون اس کے لئے کتنی قربانیاں دینے کے لئے تیار تھا! اب تو فیصلہ اس طور پر ہو گا۔ پس یہ چیزیں بڑی مختلف ہیں۔ ایک وعظ کی بات ہے، عقیدے کی دعوت ہے، اس کی تبلیغ ہو رہی ہے جیسے عیسائی مشنریز۔ نظام سے ان کو کوئی غرض نہیں، کوئی تعرض نہیں، اس پر کوئی تنقید و نکیر نہیں، تمہارا جو نظام ہے رکھو۔ ملوکیت ہے تو رہے ہمیں اس سے کیا لینا ہے۔ کوئی قوم دوسری قوم پر مستبدانہ طور پر مسلّط ہے تو ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ہمیں تو اپنے عقیدے کو پھیلانا ہے۔ وہ بھی اکثر و بیشتر (BACK DOOR) سے پھیلایا جاتا ہے کہ معاشرے کے گرے پڑے طبقات میں کہیں دودھ اور گھی کے ڈبے بانٹ دیئے کہیں بسکٹ اور اسی نوع کی چیزیں تقسیم کر دیں۔ کہیں ان کے علاج و معالجہ کے لئے ہسپتال قائم کر دیئے۔ کہیں ان کی تعلیم کے لئے مشنریز اسکول اور کالج کا انتظام کر دیا۔ ان طور طریقوں سے ان کے ذہنوں میں اپنا عقیدہ داخل کر دیا۔ باقی اللہ اللہ خیر صلا۔ ان کے پاس نہ کوئی نظام ہے نہ شریعت۔ محض عقیدہ

ہے یا چند رسوم (RITUALS) ہیں۔ ان کا کام اس پر ختم ہو جاتا ہے کہ پہلے کسی کا نام عنایت اللہ یا کرشن چندر تھا تو ان کے نام عنایت مسیح اور کرشن مسیح میں تبدیل کرا دیئے اور مردم شماری میں ان کا نام و مذہب بدلوا کر ان لوگوں کو مطمئن کر دیا جو اوپر بیٹھے اس کام کے لئے اربوں ڈالر سے بھی زیادہ رقوم کے سالانہ بجٹ فراہم کرتے ہیں۔ تو یہ تبلیغ انقلابی تبلیغ نہیں ہے۔ انقلابی تبلیغ تو وہ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔ آنحضورؐ نے ڈنکے کی چوٹ اعلان فرمایا وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ۔ میں تمہارے مابین عدل قائم کرنے آیا ہوں۔ میں مامور من اللہ ہوں۔ میری بعثت کا تکمیلی مقصد یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ دین اور میزان، (شریعت) اللہ کا نازل کردہ وہ نظام عدل و قسط بالفعل قائم کر دوں کہ جس سے حق دار کو اس کا مکمّل حق مل جائے حق بحق دار رسید!! کوئی شخص اور کوئی طبقہ کسی کے حقوق پر دست درازی نہ کر سکے۔ کوئی کسی پر ظلم نہ کر سکے جو ظالم کا ہاتھ پکڑے اور مظلوم کی دادرسی کرے۔ وہ نظام جو عدوان، جور، ظلم اور استحصال سے پاک و صاف نظام ہو ــــ میں محض واعظ بن کر نہیں آیا ہوں ــــ آیت کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں دعوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا انقلابی پہلو کوزے میں سمندر کی مانند سمویا ہوا ہے۔ سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا یہ انقلابی پہلو عموماً لوگوں کی نگاہوں کے سامنے نہیں ہے۔ حالانکہ آنحضورؐ کی بعثت کی امتیازی شان ہی اللہ کی کبریائی، اس کی حاکمیت پر مبنی نظام عدل و قسط کا قیام اور اس کا غلبہ ہے۔ بالکل آغاز ہی میں آں حضورؐ اس منصب پر فائز فرمائے گئے تھے۔ سورۃ مدثر کی ابتدائی تین آیات ذہن میں لایئے جو اکثر مفسرین کے نزدیک تیسری وحی ہے: یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ یہی بات سورۃ فتح، سورۃ توبہ اور سورۃ صف میں بایں الفاظِ مبارکہ فرمائی گئی: هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ۔ دنیا میں جو بھی نظام ہائے اطاعت رائج ہیں ان سب پر اللہ کے دین کو غالب کرنا آنحضورؐ کا فرضِ منصبی ہے۔ اپنی حیاتِ طیبہ میں آپؐ نے بنفسِ نفیس جزیرہ نمائے عرب میں بالفعل یہ نظام قائم کر کے اور چلا کے دکھایا۔ اسی انقلابی نظریہ اور دین کو خلافت راشدہ نے اس وقت کی معلوم و مہذب دنیا کے بڑے حصّہ پر غالب کر دیا ــــ اسی بات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آیت زیرِ مطالعہ

کے اس حصّہ میں کہلوایا گیا ہے:

وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمْ

حجت بازی سے کنارہ کشی کا اصل الاصول

آگے چلئے۔ ابھی آیت نمبر ۱۵ ہی چل رہی ہے۔ جس میں پہلے حضورؐ سے فرمایا گیا کہ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ۔ یعنی مشرکین کی شدید ترین مزاحمت اور اہل کتاب کی بدترین مخالفت کے باوجود آپؐ اللہ تبارک و تعالیٰ کی عبادت پر مبنی اقامتِ دین کی دعوت دیتے رہیے۔ ان معاندین کی طرف سے جو تشدد اور تعدّی ہو رہی ہے اس پر صبر کیجئے اور اپنے موقف پر مستقیم رہیے۔ جمے رہیئے۔ ان کی خواہشات کی قطعی پرواہ نہ کیجئے اور ان سے کہہ دیجئے کہ میں تو اس کتاب پر ایمان رکھتا ہوں جو اللہ نے نازل فرمائی ہے اور کہہ دیجئے کہ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمْ: اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل قائم کروں ـــــ آگے آں حضورؐ کو جو کہنے کا حکم آرہا ہے اس حصّہ کا بھی تعلق "قُلْ" سے ہے:

اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۖ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۖ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۖ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝

"(اے نبی کہہ دیجئے) اللہ ہی ہمارا رب ہے اور تمہارا رب بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ ہمارے درمیان کوئی حجت بازی اور کوئی جھگڑا نہیں۔ اللہ ہم سب کو ایک روز جمع کرے گا اور اسی کی طرف سب کو لوٹنا ہے۔"

یہ بات کس سے کہی جا رہی ہے! مشرکین سے بھی اور خاص طور پر اہل کتاب سے جن کا ذکر ماقبل آیت میں آچکا ہے ـــــ لہٰذا قریب تر وہی ہیں۔ ویسے بھی توحید کے وہ مقر، نبوت و رسالت سے وہ واقف، نبی آخر الزماں کے ظہور و بعثت کے وہ منتظر، پھر بھی وہ مخالفت میں پیش پیش۔ اسی لئے ان سے خطاب کر کے سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا: وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۖ "اور ایمان لے آؤ اس کتاب پر جو ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر) نازل کی ہے۔ اور جو اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو تمہارے پاس پہلے سے موجود ہے۔ لہٰذا تمہارے لئے یہ بات ہرگز مناسب نہیں بلکہ

جائز نہیں کہ تم ہی سب سے پہلے اس کا انکار کرنے والے بنو"۔ تمہارے پاس تورات ہے جو۔۔۔ ھُدًی وَّنور ہے۔ اس کے باوجود تم ہمارے رسولؐ کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہے ہو۔ مشرکین مکّہ کی پیٹھ ٹھونک رہے ہو۔ ان کو حجّت کے لئے مواد فراہم کر رہے ہو ۔۔۔ ان کو ہمارے نبیؐ سے طرح طرح کے سوالات کرنے اور الجھنے کی ترکیبیں سکھا رہے ہو ۔۔۔ سُن رکھو کہ اللہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ معقول دلائل سے حق تم پر واضح ہو چکا ہے۔ اب ہمارے اعمال کا نتیجہ ہمیں ملے گا اور اپنے اعمال کا نتیجہ تم بھگتو گے ۔۔۔ ہمارے مابین کسی حجّت بازی اور کج بحثی کی ضرورت نہیں ہے۔ تم کہتے ہو کہ ہم توحید پر کاربند ہیں اور دین ہی کے لئے کام کر رہے ہیں تو اللہ عالِمُ الغیب ہے وہ فیصلہ فرمادے گا۔ اگر خلوص سے ہم توحید پر عمل پیرا ہیں اور اس کے دینِ توحید کو ایک نظام حیات کی حیثیت سے قائم کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں تو ہم اللہ سے اجر پالیں گے ۔۔۔ ہم تمہارے اعمال کا اجر نہیں لے سکتے۔ تم ہمارے اعمال کا اجر نہیں پا سکتے۔ ہر شخص اپنے اپنے اعمال کے اعتبار و لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے ہاں مسئول و ماجور ہوگا۔ کُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا کَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ ط "ہر ذی نفس اپنی کمائی کے عوض اللہ کے ہاں رہن ہے"۔ جو نیکی یا بدی وہ کمائے گا اسی کے مطابق اسے بدلہ مل کر رہے گا ۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو بالحق تخلیق فرمایا ہے۔ تاکہ آخرت میں ہر متنفّس کو اس کی اس دنیا میں کمائی کا پورا بدلہ دیا جائے۔ وہاں لوگوں پر ہرگز ظلم نہیں کیا جائے گا۔ کسی کی حق تلفی نہیں ہوگی۔ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ ۔۔۔ لہٰذا لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اللہ ایک روز ہم سب کو جمع کردے گا۔ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا۔ اس حصّہ کی شرح میں آگے بیان کروں گا۔ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ○ اور ہم سب کو اسی کی طرف جانا ہے۔

ہمارے لیے عظیم رہنمائی

موجودہ حالات میں اس آیت کے آخری حصّہ میں ہمیں بڑی عظیم رہنمائی ملتی ہے۔ امّت کی تاریخ پر چودہ صدیوں کا زمانہ بیت گیا ہے۔ امّت میں فرقے موجود

ہیں۔ لوگ اس بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ ایک حدیث میں بہتر فرقوں کا ذکر آیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہاں بہتر کی تعداد کثرت کے لئے آئی ہے۔ ورنہ اتنے فرقے موجود نہیں رہے۔ مشہور فرقے تو سنّی، شیعہ، خارجی اور معتزلہ رہے ہیں۔ ان میں بھی سنّی اور شیعہ اصل فرقے ہیں جن کے مابین قریباً ساڑھے چودہ سو برس سے مسلسل کشمکش چلی آرہی ہے۔ چونکہ ان کے مابین نہایت بنیادی' اصولی اور اساسی (FUNDAMENTAL) اختلافات ہیں۔ خلافت کا تصوّر اور امامت کا تصوّر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ سنّی مکتب فکر کے نزدیک معصومیت خاصۂ نبوّت ہے۔ نبی کے علاوہ کوئی معصوم نہیں۔ نبوّت ختم ہوئی تو معصومیت بھی ختم ہوئی جبکہ شیعہ مکتب فکر میں امام کی معصومیّت جزو ایمان ہے۔ پھر ان کے ہاں امامت صرف آلِ فاطمہؓ میں منحصر ہے اور ان کے لئے مختص ہے۔ ان کے ہاں البتہ کئی فرقے ہیں جن میں وہ بھی ہیں جو امامِ غائب کے قائل اور ان کے ظہور کے منتظر ہیں اور وہ بھی ہیں جن کا امام مسلسل چلا آرہا ہے۔ اور ہر دور میں حاضر و موجود رہتا ہے۔ ان میں حلول کے قائل بھی موجود ہیں ———— مجھے اس وقت اس مسئلہ پر گفتگو نہیں کرنی۔ صرف اتنا جان لیجئے کہ اس مکتب فکر یعنی اہل تشیع میں بیشمار فرقے ماضی میں بھی رہے ہیں اور اب بھی موجود ہیں —— باقی رہا اہل سنّت والجماعت کا معاملہ تو یہ غلط فہمی دور کرلیجئے کہ حنفی ہوں، مالکی ہوں، شافعی ہوں، حنبلی ہوں' اہل حدیث ہوں ان کے مابین کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ یہ حقیقت میں ایک ہی ہیں۔ چند فقہی امور و مسائل کی تفصیلات کی تعبیر، توضیح، تشریح، تفسیر، ترجمانی (INTERPRETATION) اور انطباق و استنباط (IMPLICATION) میں تھوڑا تھوڑا اختلاف واقع ہوجاتا ہے۔ میں اس بات کو پہلے بھی وضاحت سے بیان کرچکا ہوں۔ یہ تو ہماری بدقسمتی ہے کہ چند پیشہ ور واعظوں اور چند علمائے سوٗ نے اپنی مسندیں، اپنی قیادتیں، اپنی چودھراہٹیں اور اپنی سیادتیں قائم رکھنے اور چمکانے کے لئے چند فروعی مسائل کو جن کی دین میں گنجائش موجود ہے نزاعی مسائل بنا کر مورچہ بندی کررکھی ہے اور اپنی انانیت کے تحت اُمّت کی وحدت کو پارہ پارہ کر رکھا ہے۔ اس وقت مجھے اس سے بھی بحث نہیں ہے بلکہ مجھے اس موقعہ پر جو عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ خلوص و اخلاص اور نیک نیتی سے دین کا کام کرنے والوں میں بھی اختلاف ہوسکتا ہے۔ رائے کا بھی اور طریقِ کار کا بھی ——

یہ اختلاف بھی مبنی بر اخلاص ہو سکتا ہے۔ اس کو ایک سادہ سی مثال سے اس وقت میں آپ کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں اس لئے کہ یہ ایک عملی مسئلہ ہے۔

ایک ایسے پرانے مریض کا تصور کیجئے جو کسی ایک مرض میں نہیں بلکہ بہت سی بیماریوں میں مبتلا ہے۔ اس کی حالت متعدد امراض کی وجہ سے ناگفتہ بہ ہے ۔۔۔۔ اس کے دل میں بھی ضعف ہے اس کا جگر بھی خراب ہے۔ اس کے گردے بھی ماؤف ہو رہے ہیں۔ نزلے اور زکام میں بھی وہ مبتلا ہے۔ اب اگر آپ اس مریض کے علاج و معالجہ کے لئے چار حکیم یا ڈاکٹر لا کر کھڑے کر دیں گے۔ ظاہر بات یہ ہے کہ حکیم اور ڈاکٹر کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا مریض اس کے علاج سے شفا پائے اور صحت یاب ہو جائے۔ وہ مریض کے لئے چاہتا ہے یا اپنی نیک نامی، شہرت اور منفعت کے لئے چاہتا ہے اس کو چھوڑیئے۔ بہرحال وہ مریض کی شفا ضرور چاہے گا لیکن ہو سکتا ہے کہ پورے خلوص و اخلاص اور نیک نیتی کے باوجود ان چاروں کی تشخیص اور تجویز میں بھی فرق ہو۔ ایک کی تشخیص و تجویز یہ ہو کہ اس کے جگر کی فکر کرو۔ اہمیت جگر کی ہے۔ دوسرے کا خیال ہو کہ اہمیت گردوں کی ہے ان کی فکر کرو۔ کہیں گردوں نے کام چھوڑ دیا تو مریض ہاتھ سے گیا۔ تیسرے کی رائے ہو کہ اس وقت اصل توجہ پھیپھڑوں پر دی جانی چاہئے اور پہلے نزلہ و زکام کی فکر کرنی چاہیئے چوتھے کا اصرار ہو کہ دل کا معاملہ اوّلین اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی پہلے فکر لازم ہے۔ چاروں معالج مخلص ہیں۔ دل سے مریض کی شفا کے متمنی ہیں لیکن تشخیص و تجویز میں اقدمیت و اوّلیت اور اہمیت کے معاملہ میں اختلاف کر رہے ہیں۔

اس مثال میں اب مریض کی جگہ امتِ مسلمہ کو رکھ لیجئے۔ کوئی مخلص و دیانتدار اور درد مند اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ شیطان کے ہتھکنڈوں، اغیار کی ریشہ دوانیوں، دوست نما دشمنوں کی سازشوں کے باعث امت صدیوں سے بیمار ہوتے ہوتے فی الوقت اعتقادی، فکری و نظری اور عملی و اخلاقی اعتبارات سے بے شمار بیماریوں اور خرابیوں میں مبتلا ہے۔ اللہ کے دین کا جھنڈا اتمام و کمال کہیں بھی سربلند نہیں ہے۔ جو دین فاران کی چوٹیوں سے آفتابِ عالم تاب کی طرح طلوع ہوا تھا، جس نے نورِ توحید سے کرۂ ارضی کے ایک بڑے حصہ کو منور کر دیا تھا، آج اس دین پر غربت و مسکنت طاری ہے۔ کفر و الحاد، شرک و زندقہ، بدعات کے اندھیاروں میں یہ آفتابِ ہدایت گہنا گیا ہے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ چند لوگوں کے دلوں میں اپنے دین

اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا درد پیدا فرماتا ہے ۔ وہ لوگ غور و فکر کرتے ہیں کہ تجدید و احیاء دین اور اصلاحِ امت کے کام کا آغاز کس طور سے کیا جائے۔ کس کام کو اقدمیت و اوّلیت دی جائے۔ جس رائے پر ان کا دل ٹھک جاتا ہے۔ انہیں انشراحِ صدر حاصل ہو جاتا ہے اس کے مطابق کام کے لئے وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ تمام معاملہ اجتہادی ہوتا ہے اس لئے کہ وحی کا سلسلہ تو منقطع ہو چکا۔ نبوت تو جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی۔ لہٰذا جو دردمند شخص احیاءِ دین اور اصلاحِ امت کے لئے اٹھتا ہے وہ اجتہادی طور پر کوشش کرتا ہے کہ بہتر سے بہتر طریق پر دین کی تجدید کا، اسلام کی سربلندی کا، اقامتِ دین کا، امت کی اعتقادی و عملی خرابیوں کی اصلاح کا کام کر دل۔ اس کی تشخیص اور تجویز سے پورے اخلاص و خلوص اور نیک نیتی کے باوجود بھی اختلاف ممکن ہے۔ اس بات کو سامنے رکھئے اور آیت کے آخری حصے کو پڑھئے اور یہ نتیجہ اخذ کیجئے کہ ایسے اشخاص اور ایسی جماعتوں کو باہم دست و گریباں نہیں ہونا چاہیئے۔ اپنے اپنے طریقوں پر دین کی خدمت اور احیاءِ اسلام کے لئے خلوص و اخلاص کے ساتھ عمل پیرا رہیں لیکن ایک دوسرے پر الزام تراشی نہ کریں، ایک دوسرے کی ٹانگیں نہ گھسیٹیں، اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف جذبات پروان نہ چڑھائیں بلکہ جہاں تک ہو سکے تعاون و اشتراک کا معاملہ رکھیں۔ ایک دوسرے کے خیرخواہ رہیں اور انداز وہ اختیار کریں جس کی طرف ہمیں اس آیتِ مبارکہ کے ان الفاظ میں رہنمائی مل رہی ہے کہ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ "اللہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے"۔ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ "ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال"۔ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ "ہمارے اور تمہارے مابین حجت بحث و تمحیص اور مناظرہ کی کوئی ضرورت نہیں" اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا۔ اگر ہم مخلص ہیں اور اخلاص کے ساتھ کام کر رہے ہیں اور تم بھی مخلص ہو اور خلوص سے کام کر رہے ہو تو اللہ ایک دن ہمیں جمع کر دیگا منزل اگر ایک ہے تو لازماً سب ایک دن ایک جگہ جمع ہو جائیں گے ——— میں اس کے لئے یہ مثال دیا کرتا ہوں کہ ۹ ذی الحجہ کو منیٰ سے لاکھوں انسان چلتے ہیں، سب کو جانا عرفات ہے۔ وقوف عرفہ کرنا ہے، وہی اصل حج ہے۔ عرفات جانے کے لئے ہزاروں قافلے بنے ہوتے ہیں۔ ہر ایک کا جھنڈا علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے۔ اور اونچا رکھا جاتا ہے تاکہ اس قافلے کا کوئی آدمی ذرا اِدھر اُدھر ہو جائے تو اپنے جھنڈے کو دیکھ کر قریب آجائے ورنہ بچھڑ جائے گا اور دوبارہ ملنا مشکل

ہو جائے گا۔ اب یا تو ۱۰ ذی الحجہ کو منیٰ میں ملاقات ہو گی یا تین چار دن بعد مکہ مکرمہ میں۔ لہٰذا لوگ قافلوں کی شکل میں چلتے ہیں لیکن منزل سب کی ایک ہے ___ جن لوگوں کو حال ہی میں حج کی سعادت نصیب ہوئی ہو وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اب تو منیٰ سے عرفات کے لئے چھ بڑی کشادہ سڑکیں ہیں لیکن یہ سب سڑکیں قافلوں کو آخر کار عرفات پہنچائیں گی۔ سب قافلے وہاں جمع ہو جائیں گے۔ پس دین کی خدمت یا اقامتِ دین کی جدوجہد جو لوگ اور جو جماعتیں بھی خلوص و اخلاص کے ساتھ کر رہی ہیں اور ان کے طریق کار میں اختلاف ہے ___ طریق راستے ہی کو کہتے ہیں ___ تو جیسے منیٰ سے عرفات کے لئے چھ طرائق یعنی راستے جا رہے ہیں، اسی طرح ان لوگوں اور جماعتوں کے طریق کار بھی مختلف ہو سکتے ہیں ___ چونکہ یہ اجتہادی معاملہ ہے اب یہاں اور کہیں بھی نبوت نہیں ہے۔ لہٰذا طریق کار میں اختلاف ہو تو فکرمندی کی کوئی بات نہیں۔ اگر منزل ایک ہے تو قریب سے قریب تر ہوتے چلے جائیں گے۔ اور آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں منزل پر پہنچ کر تو سب ایک ہی جگہ جمع ہو جائیں گے۔ چلئے اگر دنیا میں ہم قریب نہ بھی ہوئے تو ایک دن آنا ہے جب اپنے رب کے حضور میں حاضری ہوگی: اَللّٰہُ یَجْمَعُ بَیْنَنَا وَاِلَیْہِ الْمَصِیْرُ۔ آخر لوٹنا تو وہیں ہے۔ وہیں پتہ چل جائے گا کہ کون کتنے پانی میں تھا! وہیں حقیقت کھل جائے گی کہ کس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹیاں بندھ گئی تھیں۔ کون جماعتی عصبیتِ جاہلیہ میں گرفتار ہو گیا تھا۔ کون خلوص کے ساتھ چل رہا تھا! کون کس شخصیت کی عقیدت کا غلام ہو گیا تھا! ہر ایک کی حقیقت کھل جائے گی اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا ہو جائے گا کون مخلص تھا اور کون غیر مخلص! وہاں سب عیاں ہو جائے گا۔ جو مخلصین ہوں گے وہ باہم دگر شیر و شکر ہو جائیں گے۔

اس موقع پر میرا ذہن ایک واقعہ کی طرف منتقل ہوا ہے۔ سورۂ حجر میں الفاظ آئے ہیں: وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِھِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ○ "اور ہم ان کے دلوں میں اگر ایک دوسرے کی طرف سے میل ہوا تو ہم اسے نکال دیں گے اور وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھیں گے۔" یہ اہل ایمان کا ذکر ہو رہا ہے کہ جب ان سے کہا جائے گا کہ جنت میں سلامتی کے ساتھ بے خوف و خطر داخل ہو جاؤ! اُدْخُلُوْھَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ ○ تو اہلِ ایمان کے دلوں میں بر بنائے طبعِ بشری اپنے کسی بھائی کے بارے میں کوئی رنجش اور میل ہو گا تو

جنت میں اللہ اس کو دلوں سے نکال دے گا۔ جس واقعہ کی طرف میرا ذہن منتقل ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ یہ آیت میرے اور معاویہؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ ایک دوسرے کی طرف سے دلوں میں میل توہم آیا تھا۔ جب تلواریں نیاموں سے باہر آگئی تھیں۔ تو یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ دونوںؓ کے دل ایک دوسرے سے آئینہ کی طرح صاف تھے۔ شکوہ، شکایت اور گلا ایک دوسرے سے پیدا ہوا اسی لئے حضرت علیؓ کہہ رہے ہیں کہ جنتی ہم دونوں ہیں۔ رنجش کی وجہ سے اس دنیا میں ہمارے دلوں میں جو میل آگیا ہے، جو کدورت پیدا ہوگئی ہے تو اللہ تعالیٰ جنت میں اس رنجش کو صاف کردے گا۔ اس کے لئے سورہ حجر کی حضرت علیؓ نے وہ آیت پڑھی جو میں نے آپ کو سنائی ہے۔

لہٰذا دنیا میں خلوص و اخلاص کے ساتھ دین کے لئے کام کرتے ہوئے ایک دوسرے سے گلے و شکوے ہو جاتے ہیں۔ اگر حضرتِ علی اور حضرتِ معاویہ کے مابین رنجش پیدا ہوئی (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں تو ہم کیسے یہ دعویٰ کریں گے کہ ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کی طرف سے کبھی کوئی میل آتا ہی نہیں، کوئی رنجش کبھی پیدا ہوتی ہی نہیں۔ لیکن صحیح طریقہ یہ ہے کہ یہ تصور ذہن میں رکھا جائے کہ: اَللّٰہُ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ ط لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ ط لَاحُجَّۃَ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ ط اَللّٰہُ یَجْمَعُ بَیْنَنَا وَاِلَیْہِ الْمَصِیْرُ ○ اس ضمن میں، میں ایک اور بات بھی کہا کرتا ہوں۔ ہم جمع نہ بھی ہوئے تو کوئی حرج نہیں۔ ہمارا کام تو جمع ہو جائے گا۔ آپ بھی محنت کر رہے ہیں دین کے لئے اور میں بھی دین ہی کے لئے محنت کر رہا ہوں تو ان محنتوں کے ثمرات کہاں جمع (CREDIT) ہوں گے؟ ظاہر بات ہے کہ دین کے کھاتے میں۔ فرض کیجئے کہ کوئی ایک شخص کسی ایک جماعت کے ذریعے سے دین کے قریب آجاتا ہے اور کوئی دوسرا شخص کسی دوسری جماعت کے ذریعے سے دین کے قریب آیا تو کام تو جمع ہو ہی گئے چاہے وہ قافلے جمع نہ ہوئے ہوں۔

حاصلِ گفتگو

میں نے آغاز ہی میں عرض کیا تھا کہ اقامتِ دین کے موضوع پر یہ تین آیات اہم ترین ہیں۔ اس کے مخاطبین، اس کے مخالفین، مخالفت کی وجہ، تفرقہ کا سبب، ان سب کا علاج، پھر جو داعی ہو اس کا کردار، اس کو کن باتوں کو ملحوظ رکھنا ہے۔ ان تین آیات میں یہ تمام مضامین آگئے اور میں نے اپنی امکانی حد تک ان کے

تشریح و توضیح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ ع
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آغاز ہی میں نے اس سورۂ مبارکہ کی نو آیات ۱۳ تا ۲۱ کی تلاوت کی تھی۔ اب چھ آیات باقی رہ گئی ہیں جن کا مختصر تشریح کے ساتھ ان شاء اللہ ہم مطالعہ کریں گے۔ میں آپ سے گزارش کروں گا کہ آپ اسی صبر و اطمینان اور توجہ کے ساتھ تشریف رکھیں جس کا اب تک آپ نے مظاہرہ کیا ہے تاکہ درس کا جو نصاب اس نشست کے لئے پیشِ نظر تھا وہ مکمل ہو جائے۔

مخالفین و معاندین کے لیے انتباہ

فرمایا: وَالَّذِيْنَ يُحَاۗجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ "اور کچھ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں ابھی بحث و مباحثہ اور حجت بازی میں پڑے ہوتے ہیں"۔ حالانکہ اللہ کی پکار پر لبیک کہی جا چکی۔ یہاں فِي اللّٰهِ سے مراد فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ ہے "ابھی تک جو لوگ اللہ کے دین کے بارے میں جھگڑوں ہی میں پڑے ہوتے ہیں"۔ آگے بڑھنے سے قبل آیت کے اس حصہ کو وضاحت سے سمجھ لیجئے۔ دیکھئے جب کوئی نئی دعوت اٹھتی ہے تو کچھ لوگ تو اتنے ذہین ہوتے ہیں کہ وہ اس کو اس کی (FACE VALUE) پر قبول کر لیتے ہیں اور ان میں اتنی جرأت بھی ہوتی ہے کہ: ع
ہر چہ بادا باد — ما کشتی در آب انداختیم — اب جو ہو سو ہو، ہم نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔ اب تیریں گے تو اس کے ساتھ اور ڈوبیں گے تو اس کے ساتھ — لیکن سب لوگوں میں اتنی ہمت نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں کہ جن کو حقیقت تو معلوم ہو جاتی ہے کہ بات صحیح ہے لیکن منجدھار میں چھلانگ لگانے کے لئے جو ہمت درکار ہوتی ہے اس کا ان میں فقدان ہوتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جیسے ایک جنگل ہے۔ اس میں جانے کا کوئی راستہ ہونا تو درکنار کوئی پگڈنڈی بھی بنی ہوئی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں کوئی بڑی ہمت والا ہی ہوگا جو اس میں داخل ہوگا لیکن اگر کچھ لوگوں نے چل کر کوئی پگڈنڈی بنا دی ہو تو نسبتاً کم ہمت لوگ بھی اس پر چل پڑنے کا اپنے اندر حوصلہ پیدا کر لیں گے۔ چونکہ ان کو نظر آ رہا ہے کہ راستہ بنا ہوا ہے اور کچھ لوگ اس پر چل کر جنگل میں داخل ہو گئے ہیں اور ہو رہے ہیں — یہی بات یہاں کہی جا رہی ہے: وَالَّذِيْنَ يُحَاۗجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ۔ اللہ کے دین کی دعوت پر لبیک کہے جانے کے بعد

بھی بعض لوگ دعوت کو قبول کرنے والوں سے حجت بازی کر رہے ہیں' ——————

—— میرے مطالعہ اور اندازے کے مطابق سورۂ شوریٰ کے نزول کا زمانہ مکی دور کا آخری تیسرا حصہ یعنی سن آٹھ نبوی کا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس وقت تک بہت سے ایسے لوگ بھی ایمان لا چکے تھے جو قریش میں ایک باحیثیت مقام رکھتے تھے اور ایسے بھی جو دبے ہوئے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ گویا کہ بہت سے لوگوں نے بیچ منجدھار کو دکر دکھا دیا تھا۔ بہت سے لوگوں نے تشدّد جھیل کر، مصائب برداشت کر کے اور قربانیاں دے کر اعلیٰ مثالیں قائم کر دی تھیں۔ اس طرح ان لوگوں کے لئے جو کم ہمت تھے، پگڈنڈی بن گئی ہے۔ راستہ بن گیا ہے۔ اب ان کے لئے اس پر چلنا آسان ہو گیا ہے۔ جو اب بھی تعویق میں ہوں، لیت ولعل میں ہوں، جو اب بھی حجت بازی میں پڑے ہوں معلوم ہوا کہ اب ان کا کوئی عذر اللہ تعالیٰ کی جناب میں لائقِ پذیرائی نہیں رہا۔ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ ان کی حجت، ان کی دلیل ان کے رب کے پاس بالکل باطل اور پادر ہوا ہے: وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۝ اور ان پر اللہ کا شدید غضب نازل ہو کر رہے گا۔ ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے" —— قرآن حکیم کا یہ اعجاز ہے کہ اس آیت میں ان کم ہمت لوگوں کے لئے بھی انتباہ ہے جو دعوت کو حق سمجھ لینے کے باوجود مشرکین و مخالفین کے تشدّد اور تعدّی کے خوف سے دعوت کو قبول کرنے میں ہچکچا رہے ہیں اور ان کے لئے بھی شدید وعید ہے کہ جن کے دل دعوت کی حقّانیت تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ اپنے مفادات، اپنے تعصّبات اور اپنی عصبیت کے باعث دعوت کو قبول کرنے کے بجائے اس کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں اور اس دعوت کو کچلنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اور ان کا ساتھ دے رہے ہیں جو صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ گویا وہ سرے سے دعوت کی حقانیت کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اس آیت میں تینوں قسم کے لوگ مخاطبین ہیں۔

الکتاب و المیزان —— قرآن و سنّت

اگلی آیت میں وہ مضمون آرہا ہے جو میں نے لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ کی توضیح و تشریح کے ضمن میں سورہ حدید کی ایک آیت کے حوالے سے بیان کیا تھا۔ میرے نزدیک سورہ شوریٰ

مکی سورتوں میں اتنی ہی اہمیت کی حامل ہے جتنی مدنی سورتوں میں سورہ حدید ــــ سورہ حدید میں رسولوں کی بعثت، ان کو بیّنات عطا کرنے، ان کے ساتھ کتابیں اور میزان یعنی شریعت نازل فرمانے کی غرض وغایت ان الفاظ مبارکہ میں بیان فرمائی گئی تھی کہ: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنَاتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتَابَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۔ یہاں فرمایا:

اَللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْکِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ ط

"اللہ ہی ہے وہ ذات جس نے حق کے ساتھ کتاب اتاری اور میزان بھی اتاری"

جیسے حضرت موسیٰ علیہ السّلام پر کتاب تورات نازل ہوئی تو اس کے ساتھ شریعتِ موسوی اتری۔ ویسے ہی جناب محمدؐ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر قرآن نازل ہوا تو اس کے ساتھ المیزان یعنی شریعت یا دین الحق نازل ہوا۔ یہی بات اس آیت مبارکہ کی ابتداء میں ایک دوسرے اسلوب سے فرمائی جو سورہ توبہ، سورہ فتح اور سورہ صف میں بایں الفاظ وارد ہوئی۔ ھُوَالَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ ــــ "وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو بھیجا الھدٰی اور دینُ الحق کے ساتھ" ــــ یہاں "و" واؤ عطف ہے ــــ دین الحق، الہدٰی سے مختلف شے ہے، علیحدہ چیز ہے۔ اس معنی میں کہ الہدٰی یعنی قرآن مجید میں علمی اور اصولی ہدایت ہے جبکہ سنّتِ رسول علی صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام اس کی عملی تفسیر ہے، اس کا عملی مظاہرہ (DEMONSTRATION) ہے۔ جب قرآن حکیم کے ساتھ سنّتِ رسول جمع ہو جائے گی تو دین الحق بنے گا۔ وہ میزان یعنی شریعت سامنے آئے گی کہ کس کا کیا حق ہے اور کس کے کیا فرائض ہیں۔ کیا واجبات ہیں! اور طے ہو گا کہ (WHAT IS DUE TO HIM & WHAT IS DUE FROM HIM) اس پر لازم کیا ہے اور اس کا حق کیا ہے۔ یہ ہے کتاب اور میزان جو اللہ نے نازل فرمائی ــــ

غور طلب بات

اب غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے میزان کس لئے نازل فرمائی! ایسے ہی رکھی رہے یا ہمیں ماپا اور تولا جائے! میزان تو اس لئے اتاری گئی کہ نصب ہو۔ دین اس لئے دیا گیا کہ قائم ہو ــــ دین اگر قائم نہ ہو تو وہ دین ہے ہی نہیں پھر تو وہ مذہب بن گیا۔ وہ صرف ایک عقیدہ اور ایک (CULT) بن کر رہ گیا، وہ محض چند رسوم (RITUALS) کا مجموعہ بن گیا۔ دین تو وہ ہے جو ایک نظام کی حیثیت سے بالفعل قائم و نافذ ہو۔ اس کو ایک حادہ سی

مثال سے سمجھ لیجیے۔ انگریز کے دورِ غلامی میں جس نظام کی اصل حکمرانی تھی وہ "دینِ انگریز" تھا۔ تاجِ برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے مطلقِ مطلق برطانوی پارلیمنٹ تھی۔ تمام فوجداری اور دیوانی قوانین اس کے بنائے ہوئے تھے اور ان کے مطابق ہی ملک کا نظام چل رہا تھا۔ البتہ دوسرے مذاہب کے ساتھ مسلمانوں کو بھی یہ آزادی حاصل تھی کہ نجی زندگی میں نمازیں پڑھ لو، روزے رکھ لو، حج کو چلے جاؤ، اپنے طور پر زکوٰۃ ادا کر دو۔ شادی بیاہ کی رسوم اپنے طور پر بجالاؤ۔ (PRIVATE) اور شخصی معاملات میں انگریز سرکار کو کوئی سروکار نہیں البتہ ملک کا نظام اور قانون (LAW OF THE LAND) انگریز کا بنایا ہوا رائج و نافذ رہے گا۔ اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر ہی علامہ اقبال مرحوم نے کہا تھا ؎

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اب پھر آیت زیرِ درس پر توجہ مرتکز کیجیے۔ فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ط "اللہ ہے وہ جس نے حق کے ساتھ اتاری ہے کتاب بھی اور میزان بھی" سورہ حدید میں بعثتِ رسول، انزالِ کتب و میزان کی جو غرض و غایت بیان فرمائی گئی تھی کہ: لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ط "تاکہ لوگ عدل و قسط پر قائم ہو جائیں" اس کو آیت کے اس حصے کے ساتھ ذہن و قلب پر ثبت کر لیجیے تو اَقِيْمُوا الدِّيْنَ اور وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ کے جملہ مقتضیات و متضمنات واضح ہو کر آپ کے سامنے آجائیں گے۔

انجام سے متعلق تنبیہ

آگے چلیے۔ اسی آیت کے دوسرے حصہ میں فرمایا:

وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ ■

"اور (اے نبیؐ) آپ کو کیا معلوم کہ قیامت قریب ہو اور سر پر آئی کھڑی ہو"

یہاں انداز مختلف ہے۔ اس میں انسانوں کی ایک فطری اور نفسیاتی کمزوری پر متنبہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ حقیقت کو انہوں نے پہچان بھی لیا لیکن دل کے اندر جو چور ہے اور مفادات و لذاتِ دنیوی سے جو انس ہے اس کی وجہ سے تعویق و تاخیر کا معاملہ ہوتا ہے۔ سوچ کا انداز یہ ہو جاتا ہے کہ بات تو حق ہے قبول کرنی چاہیے اور ہم ضرور قبول کریں گے ذرا فلاں فلاں کاموں سے فارغ ہو جائیں پھر ہم بھی میدان میں کود پڑیں گے۔ بس یہ یہ ذمہ داریاں ہیں ان سے نمٹ لیں، ذرا بچیوں کے ہاتھ

پہلے کرنے ہیں ان سے عہدہ برآ ہو جائیں تو پھر ہم اقامت دین کی جد و جہد میں ہمہ وقت اور ہمہ تن لگ جائیں گے اور اپنی ساری توانائیاں اور اپنے تمام اوقات اللہ کی راہ میں لگا دیں گے۔ اس سے بڑا فریب اور دھوکہ کوئی نہیں اور دھوکہ کس کو دے دیں گے۔ حقیقی بات یہ ہے کہ اس سے بڑی خود فریبی اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ عمر کا یہ دنیا کے تمام نزکرد اپنی بچیوں سے فارغ ہوں گے تو آگے نواسیاں اور پوتیاں ہونگیں۔ اپنی ذمہ داریوں سے فراغت کیسے ہوگی نسل تو آگے پھیلے گی، بڑھے گی اور نہ معلوم کیا کیا معاشرتی پیچیدگیوں (PROBLEMS) سے سابقہ پیش آ گئے گا۔ اور جب آپ اپنے کاموں سے فارغ ہوں گے ۔۔۔ اوّل تو فراغت ملتی نہیں۔ لیکن فرض کیجئے کہ کسی نے سوچ رکھا ہو کہ ریٹائر ہو جاؤں پھر دین کے لئے کام کروں گا تو حکومت بھی اس وقت ریٹائر کرتی ہے جب صلاحیت و اہلیت برائے نام رہ جاتی ہے۔ ایسی حالت و کیفیت میں آپ دین کے لئے کریں گے کیا؟ اس لئے کہ حکومت نے ریٹائرمنٹ کی مدت خوب سوچ سمجھ کر رکھی ہے۔ توانائیاں تو خدمت سرکار میں ختم ہوئیں اب تو آپ کی حیثیت (SPENT UP FORCE) کی ہے۔ یہ ہیں وہ دھوکے اور فریب جو انسان کا نفس خود اسے دیتا ہے۔ سورہ حدید میں یہ مضمون اہل ایمان کے لئے مختص ہو کر آیا ہے۔ وہاں فرمایا۔ اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ "کیا وقت آ نہیں گیا ہے اہل ایمان کے لئے کہ جھک جائیں ان کے دل اللہ کی یاد میں بھی اور اس حق کے سامنے بھی کہ جو نازل ہو گیا ہے" ۔۔۔ یہ تاخیر اور تعویق۔ اور یہ بات کہ یہ کر لوں وہ کر لوں پھر دین کے کام میں لگ جاؤں گا ۔۔۔ خود فریبی کے اس چکر سے کب نکلو گے اور یہی بات نبی اکرمؐ سے مخاطب ہو کر بطور واقعہ اور حقیقت فرمائی جا رہی ہے۔ وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِیْبٌ ۝ "اور (اے نبیؐ) آپ کو کیا خبر کہ قیامت (فیصلہ کی گھڑی) قریب ہی آ لگی ہو۔"

انتہائی قابل توجہ بات

اچھی طرح ذہن میں رکھئے کہ ایک قیامت تو آخری قیامت ہے اور ایک میری اور آپ کی انفرادی (INDIVIDUAL) قیامت ہے۔ یعنی "میری اور آپ کی موت"۔ وہ تو ہم سب کے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ ہم میں سے کون جانتا ہے کہ وہ کب آئے گی! جگر مراد آبادی مرحوم کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

اربابِ ستم کی خدمت میں اتنی ہی گذارش ہے میری
دنیا سے قیامت دور سہی دنیا کی قیامت دور نہیں

موت کی صورت میں ایک قیامت انسان پر اس دنیا میں بھی آتی ہے جسے ہم قیامت صغریٰ کہتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِیَامَتُہٗ "جو مر گیا اس کی قیامت تو قائم ہو گئی" مہلتِ عمر اور مہلتِ عمل ختم ہوئی —— کیا معلوم وہ چھوٹی قیامت میرے سر پر منڈلا رہی ہو۔ مجھے لاہور جانا نصیب نہ ہو۔ کسے یقین ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ کل صبح طلوع ہونے والا سورج میں لازماً دیکھوں گا۔ اگر دل میں یہ یقین ہو تو بہت بڑا دھوکہ ہے۔ فرمایا: وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیْبٌ ۔ کس برتے پر، کس امید میں تم یہ چیزیں مؤخر کر رہے ہو! اللہ کی طرف سے عائد کردہ فرض ادا کرنے کی فکر کرو۔ اس کے لئے جدوجہد کرو۔ اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ۔ اس کے لئے کمربستہ ہو جاؤ۔ سربکف ہو کر میدان میں نکلو۔ باطل سے پنجہ آزمائی کے لئے تیار ہو کر آؤ۔ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ کا تقاضا خاتم النبیین والمرسلین کے امتی کی حیثیت سے پورا کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہو۔ ظلم پیدا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے جو کتاب یعنی قرآن مجید اور میزان یعنی شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام حق کے ساتھ نازل کی ہے، اس پر مبنی نظامِ عدل و قسط قائم کرنے کی جدوجہد کرو ورنہ تم کو کیا پتہ کہ موت تمہارے سرہانے کھڑی ہو، تم اسی تعویق و تاخیر میں رہو اور مہلتِ عمر تمام ہو جائے —— یہ جملہ مفاہیم اس آیتِ مبارکہ میں بیان ہوئے اَللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ ؕ وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ قَرِیْبٌ ○

آگے فرمایا:

یَسْتَعْجِلُ بِہَا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِہَا ۚ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْہَا وَیَعْلَمُوْنَ اَنَّہَا الْحَقُّ ؕ اَلَآ اِنَّ الَّذِیْنَ یُمَارُوْنَ فِی السَّاعَۃِ لَفِیْ ضَلٰلٍۭ بَعِیْدٍ ○

"اس قیامت کے دن کے لئے جلدی وہ لوگ مچاتے ہیں جو اس پر ایمان نہیں رکھتے مگر جو لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس سے ڈرتے رہتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ یقیناً اس کا واقع ہونا حق ہے۔ آگاہ رہو، خوب اچھی طرح سن رکھو جو لوگ اس گھڑی کے آنے میں شک میں ڈالنے والی بحثیں کرتے ہیں وہ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں"

اس آیت میں نہایت جامعیت، بلاغت اور پیارے انداز میں قیامت کے بارے

ہیں منکرین اور مؤمنین کے طرزِ فکر اور عمل پر تبصرہ فرمایا گیا ہے۔

منکرین کی عجلتِ عذاب کفار اور مشرکین کج بحثی اور ضد برائے ضد کے طور پر اس طرح کی باتیں کیا کرتے تھے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لے آؤ وہ قیامت یا وہ عذاب جس کا تم ہمیں ڈراوا دیتے چلے آ رہے ہو۔ نقل کفر کفر نہ باشد وہ کہا کرتے تھے کہ تمہیں یہ رٹ لگاتے ہوئے دس سال ہو گئے۔ آخر وہ گھڑی کب آئے گی۔؟ یہ سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے ہیں۔ لے آؤ وہ عذاب جس کی دھمکیاں تم ہمیں دیتے چلے آ رہے ہو۔ یہاں تک کہ نضر بن حارث نامی ایک مشرک نے کھڑے ہو کر کہا تھا جس کا قرآن مجید میں سورہ انفال میں ذکر ہے: وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ "اور یاد کرو وہ بات جو ان کفار نے کہی تھی کہ پروردگار محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو پیش کر رہے ہیں وہ اگر تیری طرف سے واقعی حق ہے اور سچی خبر ہے تو ہم پر تو آسمان سے پتھر برسا دے یا ہم پر کوئی دردناک عذاب لے آ۔" یہ حال تھا ان کی ہٹ دھرمیوں اور ڈھٹائیوں کا۔ ایسی باتوں سے وہ اپنے عوام کو متاثر کرنا چاہتے تھے جن میں دعوتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نفوذ کر رہی تھی بقول ؏ نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے — مشرکین خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ ہمارے مفادات جو اس مشرکانہ نظام سے وابستہ ہیں، سخت خطرہ میں آئے ہوئے ہیں۔ لہٰذا وہ اس قسم کی باتوں کے ذریعہ اپنے عوام پر اپنے خلوص کا اثر قائم کرتے تھے کہ ہمیں اس دعوتِ توحید کے غلط ہونے پر اتنا اعتماد ہے کہ ہم تو یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ اگر یہ دعوت جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیش کر رہے ہیں، سچ ہے، حق ہے تو ہم پر عذاب آ جائے —— یہ تھا ان کا انداز اپنے عوام کو دعوت سے روکنے کے لئے — قرآن اس پر تبصرہ کرتا ہے کہ وہ تو قیامت اور یوم حساب پر یقین ہی نہیں رکھتے تھے۔ اسی لئے عذاب اور قیامت کی جلدی مچا رہے تھے — جس کے دل میں یقین ہوگا وہ ہرگز یہ بات زبان پر نہیں لا سکتا۔ یہی بات فرمائی ان الفاظ مبارکہ میں يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۔ "اس کے لئے وہی لوگ جلدی مچاتے ہیں جو اس پر ایمان نہیں رکھتے۔"

اہلِ ایمان اور خوفِ قیامت اس کے برعکس اہلِ ایمان کا یہ حال ہے کہ وہ قیامت کے تصور سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں: وَالَّذِيْنَ

اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ـــــ اہل ایمان کی اسی صفت کو سورۂ انبیاء میں بایں الفاظ بیان فرمایا: وَالَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ؕ جن کے قیامت کے خوف اور خشیتِ الٰہی کا نقشہ سورۂ نور کی آیت نمبر ۳۷ کے آخر میں یوں کھینچا گیا: یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝ "اہل ایمان اس دن کے خوف سے کانپتے رہتے ہیں کہ جس دن دل اُلٹ جائیں گے اور نگاہیں الٹ جائیں گی"۔ ـــــ قیامت کی ہولناکیوں اور محاسبۂ اخروی سے امت اور صحابہ کرامؓ میں سے فضیلت کے اعتبار سے بالترتیب اوّل، دوم اور سوم اور عشرہ مبشرہ میں شامل نفوس قدسی اس طرح ڈرتے رہتے تھے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ عالم تھا کہ آپؓ کہا کرتے تھے کہ "کاش میں ایک سوکھا تنکا ہوتا جو جلا دیا جاتا ہے، ختم ہو جاتا ہے اس سے محاسبہ نہیں ہے۔ کاش میں درختوں پر چہچہاتی ہوئی ایک چڑیا ہوتا جو آج ہے کل نہیں ہوگی لیکن اس سے محاسبہ کوئی نہیں ہے"۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے انتقال کے وقت کہہ رہے ہیں کہ "کاش میں برابر سرابر پر چھوٹ جاؤں"۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے وقت آخر اپنے والد کا سر اپنی ران پر رکھا تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ میرا سر نیچے ڈال دو۔ انہوںؓ نے پوچھا آپؓ اتنے پریشان کیوں ہیں؛ یہ بےچینی کیوں ہے! آپؓ تو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ آپؓ کو تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی ہے جنت کی ـــــ تو جواب میں حضرت عمرؓ کہتے ہیں "خدا کی قسم اگر میں برابر سرابر بھی چھوٹ گیا تو بہت بڑی کامیابی تصور کروں گا"۔ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب کسی قبر پر کھڑے ہوتے تو اس قدر روتے کہ داڑھی اشکوں سے تر ہو جاتی۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ آپؓ دوزخ کے ذکر پر اتنے اشکبار نہیں ہوتے جتنے قبر پر ہوتے ہیں۔ آپؓ نے جواب میں کہا کہ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ "قبر پہلی منزل ہے اگر کوئی اس سے نجات پا گیا تو اس کے بعد آسانی ہے اور اگر اس سے ہی نجات نہ پائی تو اس کے بعد اس سے بھی زیادہ سختی ہے"۔ مزید حضرت عثمانؓ اکثر اشکبار کہا کرتے تھے کہ "اگر میں دوزخ اور جنت کے درمیان ہوں اور مجھے معلوم نہ ہو کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا، میرے لئے ان میں سے کس کا حکم دیا جائے گا تو میں اس کا حال معلوم کرنے سے قبل راکھ ہو جانے

کو پسند کروں گا کہ مبادا میرے لئے دوزخ کا فیصلہ ہو جائے"۔

یہ ہے ان لوگوں کا حال جو اصل عارف ہیں، جو پہچاننے والے ہیں جو حقیقت کا علم رکھنے والے ہیں۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "جو کچھ میں جانتا ہوں اے مسلمانو! اگر تم وہ جانتے تو تمہارے ہونٹوں پر کبھی مسکراہٹ تک نہ آتی۔ اَوکما قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ــــ حقائق بڑے تلخ ہیں، جو ان سے غافل ہیں وہی ہیں جو اس دنیا میں قہقہے بھی لگا رہے ہیں اور محاسبۂ اخروی سے بے نیاز ہو کر بے فکری سے زندگی بسر بھی کر رہے ہیں، دندناتے پھر رہے ہیں۔ انہیں پتہ نہیں ہے کہ موت کے بعد کیا بیتنے والی ہے۔ موت کے اس پردے کے پیچھے کون سے ابدی و لازوال خسارے سے واسطہ پڑنے والا ہے۔ اس کے برعکس اہل ایمان کے متعلق فرمایا: وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا۔ اہل ایمان تو قیامت کی گھڑی کے یقین سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں ــــ وَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ؕ اور انہیں خوب معلوم ہے کہ وہ گھڑی آکر رہے گی یہ یقینی حتمی اور قطعی بات ہے ــــ اَلَاۤ اِنَّ الَّذِیْنَ یُمَارُوْنَ فِی السَّاعَةِ لَفِیْ ضَلٰلٍۭ بَعِیْدٍ ۝ آگاہ ہو جاؤ، خبردار رہو، اچھی طرح سن رکھو جو لوگ اس قیامت اور ساعت کے بارے میں جھگڑوں میں پڑے ہوتے ہیں وہ بہت دور کی گمراہی میں مبتلا ہو چکے ہیں ــــ !!!

قبولِ حق میں ایک اہم رکاوٹ اور اس کا حل

میں نے عرض کیا تھا کہ توحید عملی کی معراج فریضہ اقامتِ دین کی ادائیگی کے لئے جدوجہد، محنت و کوشش اور جہاد و کشمکش ہے۔ اسی کے لئے تمام رسولوں کی بعثت ہوئی، کتابیں اور شریعتیں نازل ہوئیں اور اس موضوع پر سورۂ شوریٰ کو ذروۂ سنام (چوٹی) کا مقام حاصل ہے۔ اس راہ کے چند موانعات کا ذکر بھی ہم پڑھ چکے ہیں اور ان کی وجوہ بھی ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ مشرکوں کو یہ دعوت کیوں ناگوار ہے: کَبُرَ عَلَی الْمُشْرِكِیْنَ کے ضمن میں اس بات کو ہم نے سمجھ لیا ہے۔ اہلِ کتاب کی مخالفت و بَغْیًا بَیْنَهُمْ کی تشریح و توضیح کے ضمن میں بیان ہو چکی ہے۔ حق کو اچھی طرح جان اور پہچان لینے کے باوجود تعویق و تاخیر اور لیت و لعل کے رویّہ کے چند اسباب بھی ہمارے

سامنے آچکے ہیں۔ اب اگلی آیت میں ایک رکاوٹ کا براہِ راست تو ذکر نہیں ہے لیکن اس کے بین السطور وہ رکاوٹ منہ سے بول رہی ہے اور اس کا حل مثبت اسلوب میں سامنے لایا جا رہا ہے۔ فرمایا:

اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝

"اللہ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے۔ جسے وہ چاہتا ہے سب کچھ دیتا ہے اور وہ بڑی قوت والا اور زبردست و غالب ہے۔"

دعوتِ توحید کو قبول کرنے اور اس کے لئے مجاہدہ کرنے میں ایک بڑی رکاوٹ معاش کا مسئلہ ہوتا ہے۔ تاویلِ خاص کے طور پر دیکھیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید پر جن سعید روحوں نے لبیک کہا تھا ان پر جہاں مصائب و مظالم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے وہاں ان کا معاشی مقاطعہ بھی کیا جا رہا تھا۔ لہٰذا اکثر لوگ دعوت کو حق سمجھتے ہوئے بھی اس کو قبول کرنے سے گریزاں تھے اس لئے کہ اگر معاشی مقاطعہ ہو گیا تو کہاں سے کھائیں گے اور اپنے بال بچوں کو کھلائیں گے۔ اس ماحول میں روکھی سوکھی روٹی کے بھی لالے پڑنے کا شدید اندیشہ لاحق رہتا تھا۔ تاویلِ عام کے لحاظ سے دیکھیے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ ہمیں خوب اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ اقامتِ دین کی جدوجہد فرض ہے: اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔ لیکن یہ قدم کیسے بڑھائیں؟ اندیشہ یہ لاحق ہے کہ کھائیں گے کیا؟ پہنیں گے کیا؟ معاش کا بندوبست کیسے ہو گا؟ اس طرف بڑھتا ہوں تو میرا کاروبار بیٹھتا ہے۔ سودی لین دین چھوڑ دوں تو اس کا مطلب ہے کہ بساط لپیٹ دوں۔ اگر رشوت لینا چھوڑتا ہوں تو اپنا معیارِ زندگی کیسے قائم رکھ سکوں گا، جس کا خوگر ہو چکا ہوں۔ میرے بیوی بچے تو پراٹھوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ اب ان کو سوکھی روٹی کیسے کھلاؤں گا! ان کو جو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلانے کے منصوبے ہیں ان پر عمل کیسے ہو گا۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ یہ ہے وہ سب سے بڑی رکاوٹ اور سب سے بڑا مخمصہ جس سے ایسا شخص دوچار ہوتا ہے جس پر حق واضح ہونے کے باوجود اس کی طرف پیش قدمی سے وہ ہچکچاتا ہے۔ اسی طرف حضرت مسیح علیہ السلام کے مواعظ میں مختلف اسالیب سے توجہ دلائی گئی ہے۔ ایک وعظ میں آنحضرت کے الفاظ آئے ہیں:

"کیوں فکر کرتے ہو کہ کیا کھاؤ گے اور کیا پیو گے۔ تم جنگل کی چڑیوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ نہ ہل چلاتی ہیں، نہ بوتی ہیں، نہ کاٹتی ہیں نہ کھتوں میں بھر کر رکھتی ہیں لیکن پھر بھی وہ صبح کو خالی پیٹ اپنے گھونسلوں سے نکلتی ہیں اور شام کو آسودہ ہو کر لوٹ آتی ہیں۔ اے بے یقینو! جو آسمانی باپ ان کو کھلاتا پلاتا ہے کیا وہ تمہیں نہیں کھلائے گا پلائے گا۔! تم کیوں اس فکر میں مبتلا ہو کہ کیا پہنو گے؟ جنگل کی سوسن کو نہیں دیکھتے وہ نہ بوتی ہے نہ کاتتی ہے نہ بنتی ہے پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ جتنا شاندار لباس وہ پہنتی ہے سلیمان بھی اپنی ساری شان و شوکت کے باوجود ایسا ملبّس نہ تھا۔ ــــ جو آسمانی باپ جنگل کی گھانس کو اتنا خوشنما لباس پہناتا ہے کیا وہ تمہیں نہ پہنائے گا۔"

یہ ہے توکّل علی اللہ کا ایک انداز جو اب بھی محرّف اناجیل میں موجود ہے۔ چونکہ نور تو ایک ہی ہے، مشکوٰۃ تو ایک ہی ہے، طاق تو ایک ہی ہے۔ جہاں یہ دیئے اور چراغ روشن ہیں۔ بعد میں تحریفات ہو گئیں یہ بات دوسری ہے۔ ورنہ تورات کا سرچشمہ کون سا ہے! تورات بھی اللہ ہی کی کتاب ہے۔ انجیل کا منبع کیا ہے! وہی اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے۔ اللہ تبارک وسبحانہٗ ہی کے طاق کا انتہائی روشن چراغ۔ یہ قرآن مجید فرقان حمید ہے جس کو یہ خصوصی تحفظ حاصل ہے کہ اس میں لفظی تحریف نہیں ہو سکتی۔: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ؈ رزّاق حقیقی اللہ ہی ہے۔ یہی بات یہاں فرمائی: اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ؀ ــــ لطیف کے دو معنی ہیں اور دونوں یہاں بڑی بلاغت کے ساتھ آ رہے ہیں۔ ان کی وضاحت میں آگے کروں گا۔ یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رزق اپنے ذمہ لیا ہوا ہے۔ جیسے سورۂ ہود میں فرمایا: وَمَا مِنْ دَاۗبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۭ "زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو اور جس کے متعلق وہ جانتا نہ ہو کہ وہ کہاں رہتا ہے اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے" تمام مخلوق کا رزق اللہ نے اپنے ذمے لے رکھا ہے لیکن تمہیں اعتماد

نہیں ہے ۔ تمہیں یقین نہیں ہے ۔ تم اللہ پر توکّل نہیں کرتے ۔ تمہیں اس پہ بھروسہ نہیں ہے ۔ تمہیں اپنے زورِ بازو پہ بھروسہ ہے ۔ تمہیں اپنے حساب کتاب پہ زیادہ اعتماد ہے ۔ اگر تمہاری تھیلیاں بھری ہوئی ہیں تو تمہارے دل کو سکون ہے ۔ تمہاری تجوری ںوں میں اگر مال ہے تو تمہیں اطمینان ہے ۔ لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں جو کچھ ہے اس پر تمہارا یقین نہیں ہے ـــــ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے زہد کی تعریف میں فرمایا ہے کہ الزَّھَادَۃُ فِی الدُّنْیَا لَیْسَتْ بِتَحْرِیْمِ الْحَلَالِ وَلَا اِضَاعَۃِ الْمَالِ وَلٰکِنَّ الزَّھَادَۃَ فِی الدُّنْیَا اَلَّا تَکُوْنَ بِمَا فِیْ یَدَیْکَ اَوْثَقَ بِمَا فِیْ یَدَیِ اللّٰہِ ـــــ دنیا میں حقیقی زہد یہ نہیں ہے کہ دنیا کی چیزوں کو ترک کرو ۔ حلال کو اپنے اوپر حرام ٹھہرالو ۔ مال ضائع کرو ۔ بلکہ حقیقی زہد تو یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اس پہ تمہارا یقین، ایمان اور اعتماد زیادہ قائم ہو جائے بہ نسبت اس کے جو تمہارے ہاتھ میں ہے ـــــ لیکن اس کے برعکس ہمارا اعتماد اور بھروسہ تو اس پر ہے جو ہمارے ہاتھ میں ہے ـــــ یہاں فرمایا : اَللّٰہُ لَطِیْفٌ بِعِبَادِہٖ " اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے " ـــــ ہم لطف و کرم بولتے ہیں جس کے معنی مہربانی اور نرمی کے ہیں تو اس لطف سے بھی لطیف بنا ہے ۔ معنی ہوئے مہربان ـــــ لطیف کے ایک معنی باریک بین کے بھی ہیں ۔ اس معنی میں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا جوڑا آتا ہے ۔ اللطیف الخبیر ۔ نہایت باریک بین اور باخبر ۔ بڑی باریک شے کو بھی جاننے والا ۔ یہاں دونوں معانی ہیں ۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے ۔ دوسرے یہ کہ بندوں کی جو ضروریات ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی (MINUTE DETAILS) کو بھی جانتا ہے ۔ تمہیں پتہ نہیں کہ تمہیں کس چیز کی ضرورت پڑے گی ۔ اللہ کو معلوم ہے ۔ کون بچہ جانتا ہے کہ مجھے ماں کے پیٹ سے برآمد ہوتے ہی غذا کہاں سے ملے گی ! لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی غذا کا انتظام پہلے سے کیا ہوا ہوتا ہے ۔ پیدائش بعد میں ہوتی ہے اس کی غذا کا اہتمام پہلے سے کیا ہوا ہے ۔ تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری تمام ضروریات کا انتظام پہلے سے کیا ہوا ہے ۔ لیکن یہ کہ تمہیں توکّل نہیں ہے ۔ جیسے حضرتِ مسیحؑ کے وعظ میں الفاظ آتے ہیں " لیکن تم یقین نہیں کرتے ۔ تم کو توکّل نہیں ہے " تم انہی اندیشوں میں رہتے ہو کہ کیا کھائیں گے اور کیا پہنیں گے ! ان ہی اندیشوں کو دور کیا جا رہا ہے : اَللّٰہُ لَطِیْفٌ بِعِبَادِہٖ یَرْزُقُ

مَنْ یَّشَآءُ ــــ سورۂ طلاق میں یہی بات بڑے پیارے اور اطمینان بخش الفاظ میں فرمائی گئی ہے: وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ ط وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ ط اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمْرِہٖ ط "اور جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرلے گا تو اللہ اس کے لئے مشکلات سے نکلنے کا راستہ پیدا کر دے گا اور وہاں سے اس کی ضروریات پوری کرے گا جہاں اسے گمان تک نہ گیا ہو۔ اور جو اللہ پر توکل کرے تو اس کے لئے اللہ کافی ہے۔ بلاشبہ بالتحقیق اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے"۔ لہٰذا اس تبارک و تعالیٰ کی ذات پر توکّل تو کرو، اس کے راستہ پر آؤ تو سہی ــــ وہ تھوڑا سا امتحان بھی لے گا کہ واقعی توکّل ہے یا جھوٹ موٹ کا توکّل کر کے آیا ہے۔ واقعی ہم پر اعتماد ہے یا صرف دعوٰی ہی دعوٰی ہے۔ وہ تھوڑا سا امتحان لے کر اور ٹھوک بجا کر ضرور دیکھتا ہے۔ پھر جو اپنے آپ کو بالکلیہ اس کے حوالے کر دے تو وہ اس کی دستگیری فرماتا ہے ــــ غور کیجئے کسی شریف النفس اور بامروّت انسان کے حوالے اگر آپ اپنے آپ کو کر دیں تو وہ کبھی آپ کو بے سہارا نہیں چھوڑے گا تو کیا اللہ آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ دے گا؟ جس کی شان اسی سورہ شوریٰ کی آیت نمبر ۲۳ کے آخر میں یہ بیان ہوئی ہے: اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ شَکُوْرٌ ہ "بالتحقیق، بلاشبہ اللہ بڑا درگذر کرنے والا اور قدر دان ہے"۔ سورہ تغابن کی آیت نمبر ۱۷ کے آخر میں فرمایا: وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ ط "اور اللہ بڑا قدر دان، بڑا بردبار ہے"۔

اور سورۂ حدید میں فرمایا: ھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ "تم جہاں کہیں بھی ہو گے وہ تمہارے ساتھ ہے"۔ وہ تم سے زیادہ تمہاری ضروریات کو جاننے والا ہے۔ وہ تم سے زیادہ تمہاری مصلحتوں کو جاننے والا ہے۔ تمہارا حال تو یہ ہے کہ تم کبھی کبھی اپنے لئے خیر مانگتے مانگتے شر مانگ بیٹھتے ہو۔ وَیَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَہٗ بِالْخَیْرِ ط انسان اپنے خیال میں خیر مانگ رہا ہے حقیقت میں اپنے لئے شر مانگ رہا ہے۔ اس لئے کہ اسے معلوم نہیں ہے کہ جو چیز مانگ رہا ہوں وہ میرے حق میں خیر نہیں ہے شر ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ مچھلی ہے جو تم مانگ رہے ہو حالانکہ وہ سانپ ہے۔ وہ تمہیں مچھلی نظر آئی ہے حقیقت میں وہ سانپ ہے وہ تمہارے ہاتھ نہ لگی تو تم دل گرفتہ ہو گئے کہ اتنی دیر بعد ایک مچھلی نظر آئی تھی وہ بھی نکل گئی، مجھ پر یہ کتنا ظلم ہو گیا، تمہیں کیا معلوم کہ اس کو پکڑ لیتے تو ہلاکت سے دوچار ہوتے ــــ یہی

بات تو سورۂ کہف میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کے واقعہ میں بیان ہوئی ہے ــــ حضرت خضرؑ نے جب مسکینوں کی کشتی میں عیب پیدا کر دیا تو حضرت موسیٰؑ کو جو جلال آتا تھا اور انہوں نے اعتراض کیا تھا اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا اس کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ لیکن سوچیئے کہ اس کشتی کے مالکوں نے یہی سوچا ہوگا کہ ہم غریبوں کے پاس روزی کمانے کا یہی ایک ذریعہ تھا، اس میں بھی خرابی پیدا ہو گئی ــــ جب حضرت موسیٰؑ کو تشویش ہوئی تو کشتی کے مالکوں کو کیوں نہ ہوئی ہو گی ــــ لیکن حضرت خضرؑ نے اللہ کے حکم سے اس کا تختہ اس لئے اکھیڑا تھا کہ اگر یہ عیب پیدا نہ ہوا ہوتا تو بادشاہ نے کشتی ضبط کر لینی تھی ــــ وہاں پوری کشتی جا رہی تھی یہاں تو صرف ایک تختہ اکھڑا ہے جس کی واپس جا کر مرمت ہو جائے گی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پوری کشتی گئی تھی لیکن یہ حقائق کسی کو معلوم نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے حضرت خضرؑ کو اس پر مطلع کیا تھا ــــ یہی ہے اصل میں ظاہر و باطن کا فرق ــــ فرمایا: اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ــــ وہ قوی ہے۔ قدرت و قوّت والا ہے۔ توانا ہے۔ وہؑ زبردست اور غالب ہے۔ وہؑ جو چاہے کر گزرے۔ اسؑ کو روکنے والا کوئی نہیں۔ اس کے خزانوں میں کمی نہیں ہے۔ وہ جس کو جتنا چاہے دے دے۔ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ط اس کے فیصلے اور اس کے ارادے کے آگے کوئی رکاوٹ بننے والا نہیں ہے۔

مکافات و مجازات کا قانونِ الٰہی

آگے چلئے! فرمایا:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ○

"تم میں سے جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اُسے ہم دُنیا ہی میں دے دیتے ہیں مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔"

یہ بڑا پیارا اور اٹل قانون ہے۔ یہاں یہ مختصر طور پہ آیا ہے سورہ بنی اسرائیل کے

دوسرے رکوع میں اس موضوع کا نقطۂ عروج (CLIMAX) بیان ہوا ہے۔ ہر مضمون قرآن مجید میں کہیں نہ کہیں اپنی آخری شان میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہاں دیکھئے فرمایا: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ "جو کوئی طالب ہو آخرت کی کھیتی کا"۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ فیصلہ کیجئے کہ آپ آخرت کے طالب ہیں یا دنیا کے طالب ہیں۔ آپ کا مقصود و مطلوب آخرت ہے یا دنیا۔ عقبیٰ چاہیئے یا دنیا چاہیئے فیصلہ کیجئے۔ شعوری طور پر فیصلہ ہو پھر اس پر ڈٹ جائیے۔ یہ نہ ہو کہ دنیا ذرا ہاتھ سے جاتی دکھائی دی تو دل پژمردہ ہوگیا اور طبیعت مضمحل ہوگئی۔ اگر تم فیصلہ کر چکے ہو کہ تمہاری مراد آخرت ہے تو اگر دنیا میں کمی آرہی ہے تو تمہیں کوئی پریشانی اور پشیمانی نہیں ہونی چاہیئے۔ آدمی طے کرے کہ اولیت کس شے کو حاصل ہے، مقدم کیا ہے مؤخر کیا ہے۔ یہ فیصلہ کرے پھر اس پر جم جائے مستقیم ہو جائے۔ اسی فیصلے کو ارادہ کہا گیا ہے۔ اسی لفظ ارادہ سے لفظ "مرید" بنتا ہے۔ اَرَادَ، يُرِيْدُ، اِرَادَةً اور اسی سے اسم فاعل مرید۔ ارادہ کرنے والا۔ اب یا تو کوئی مرید ہے آخرت کا یا کوئی مرید ہے دنیا کا۔ فرمایا: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ۔ "جو کوئی آخرت کی کھیتی کا طلب گار ہے اس کا ارادہ کرلے تو اس کی کھیتی میں ہم برکت دیتے رہتے ہیں"۔ اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں جو نیک اعمال انسان آگے بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ انہیں پروان چڑھاتا ہے پالتا ہے پوستا ہے انہیں ترقی دیتا ہے۔ — وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا۔ اور جو کوئی طالب بن جاتا ہے دنیا کی کھیتی کا۔ جس کا مقصود و مطلوب دنیا بن گئی۔ نُؤْتِهٖ مِنْهَا "ہم اسے دے دیتے ہیں اس میں سے"۔ ہم یہ نہیں کرتے کہ جو بہر حال دنیا ہی کا طالب بن گیا ہے۔ جس کی مراد دنیا ہی ہوگئی ہے اسے ہم دنیا سے بھی محروم کر دیں۔ لہٰذا دنیا میں سے اُسے ہم کچھ دے دلا دیتے ہیں۔ وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ۝ پھر ایسے شخص کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ تم یہ چاہو کہ یہ بھی ملے اور وہ بھی ملے دو دو اور وہ بھی چپڑی۔ یہ مشکل ہے۔ طے کرو کہ کیا اصل مطلوب و مقصود اور مراد ہے۔! آخرت کے طلب گار ہو تو آخرت کی کھیتی میں برکتیں ہی برکتیں ہیں۔ بڑھوتری ہی بڑھوتری ہے لیکن اگر تم طالب دنیا بن گئے ہو تو اللہ تعالیٰ اس دنیا میں سے تمہیں کچھ نہ کچھ دے دلا دے گا لیکن آخرت میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ مختصر

تشریح و توضیح ہے۔ اس آیت مبارکہ کی کہ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ط

طلب کے مطابق دو جداگانہ انجام

مناسب ہوگا کہ لگے ہاتھوں میں سورہ بنی اسرائیل کی وہ آیات بھی آپ کو سنا دوں جو میرے نزدیک اس موضوع پر قرآن مجید کا ذروۂ سنام یعنی چوٹی ہیں - یہ آیات نمبر ۱۸ اور ۱۹ ہیں فرمایا:

وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ○ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ○

عجلت کہتے ہیں جلدی کو۔ دنیا کے فوائد اور اس کی لذات چونکہ نقد ہیں، موجود ہیں، سامنے ہیں لہٰذا قرآن اس کو عاجلہ سے منسوب کرتا ہے۔ دنیا عاجلہ ہے۔ فرمایا: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ۔ جسے یہ جلدی والی نعمتیں مطلوب ہیں، یہاں کا عیش، یہاں کا آرام، یہاں کی عزت، یہاں کی دولت، یہاں کی شہرت، یہاں کی ثروت، یہاں کی وجاہت، یہاں کا اقتدار جسے چاہیے ــــ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ۔ ہم جلدی سے دیدیتے ہیں اس میں سے یعنی دنیا میں سے جو ہم چاہیں اور جس کے لئے چاہیں، ــــ یہاں ایک بات مکمل ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ دنیا کے طالب بنیں۔ تو جو آپ چاہیں وہ آپ کو مل جائے۔ پھر تو یہاں ہر شخص کروڑپتی ہوتا ــــ یہاں تو بہت سے ایسے ہیں جو ساری عمر جوتیاں چٹخارتے دنیا کے پیچھے پھرتے رہتے ہیں پھر بھی اس دنیا سے بہت تھوڑا ہی ان کے ہاتھ لگتا ہے۔ اصل فیصلہ و اختیار تو اللہ تعالیٰ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ جو کوئی اس عاجلہ کا طلب گار بن جائے گا تو عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ۔ ہم اسے یہیں جلدی دے دیتے ہیں اس دنیا میں جو کچھ چاہیں اور جتنا چاہیں، ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ط

"پھر ہم اس کے لئے جہنّم کا ٹھکانا مقرر کر دیتے ہیں جس میں وہ جھونکا جائے گا۔ ملامت و مذمّت زدہ ہو کر اور دھکے دیئے جا کر" ـــــ آیت نمبر سترہ میں دنیا یعنی عاجلہ کے خواہش مندوں اور طلب گاروں کو جس انجام کار سے آخرت میں دوچار ہونا پڑے گا اس کا بیان ختم ہوا۔ اب اگلی آیت میں ان لوگوں کے انجام کو بیان کیا جا رہا ہے جو اس دنیا میں عاجلہ کے بجائے آخرت کے طلب گار ہوں گے۔ یہاں آپ دیکھیں گے کہ دو شرطیں بیان ہو رہی ہیں۔ فرمایا: وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا۔ "اور جو آخرت کا طلب گار بن جائے اس کا خواہش مند ہو اور وہ اس کے لئے محنت کرے۔ دوڑ دھوپ کرے جیسی کہ اس کے لئے محنت اور تگ و دو کرنی چاہیئے"۔ یعنی اگر زبانی کلامی آخرت کے طلب گار بن کر بیٹھ جاؤ گے تو وہ تمہاری سچّی طلب نہیں ہوگی۔ آخرت کے سچے اور حقیقی طالب ہو تو اس کے حصول کے لئے محنت کرو۔ ایسی محنت جیسی کہ اس کے لئے ضروری ہے۔ دنیا کا جو طالب ہوتا ہے کیا اسے بغیر دنیا کے دُنیا مل جاتی ہے؟ صبح سے شام تک کمر توڑ دینے والی مشقّت آدمی کرتا ہے تب جا کر کہیں دنیا ملتی ہے۔ اگر آخرت کی حقیقی طلب ہے تو اسی کی مطابقت سے محنت و مشقّت اور سعی و جہد بھی کرنی پڑے گی۔ ــــ آگے فرمایا: وَهُوَ مُؤْمِنٌ "اور وہ ہو صاحبِ ایمان"۔ توحید کے التزام اور شرک سے بالکلیہ اجتناب کے ساتھ اللہ پر ایمان رکھتا ہو۔ ان تمام احوالِ آخرت پر یقین قلبی رکھتا ہو جن کی خبریں قرآن مجید اور صحیح احادیث میں آئی ہیں۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خاتم النبیّین والمرسلین کی حیثیت سے دل سے تصدیق کرتا ہو ـــــ تو ایسے شخص کے لئے خوشخبری ہے اس انجام کی کہ: فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ○ تو ایسے ہر شخص کی محنت مشکور ہو کر رہے گی۔ اللہ تعالیٰ ان کی قدر فرمائے گا۔ ان کا مقصود و مطلوب ان کو مل جائے گا۔ اللہ کی رضا ان کو حاصل ہوگی اور آخرت میں ان کے لئے راحت، عمدہ رزق اور نعمتوں سے مالا مال جنّت ہوگی: فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ـــــ پس سورہ بنی اسرائیل کی یہ دو آیتیں بہت اہم ہیں اس موضوع پر جو یہاں سورہ شوریٰ میں اس آیت میں بیان ہوا۔ البتہ ترتیب بدلی ہوئی ہے۔ یہاں پہلے دنیا پھر آخرت کا بیان ہوا جبکہ سورہ شوریٰ میں پہلے آخرت کا پھر دنیا کا اور آخرت میں بے نصیبی کا ذکر ہوا۔ فرمایا: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَ

مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ حَرۡثَ الدُّنۡيَا نُؤۡتِهٖ مِنۡهَا وَمَا لَهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنۡ نَّصِيۡبٍ ۝

مشرکین کے پاس کوئی شریعت اور دین نہیں ہوتا

الحمدللہ ہم اب آخری آیت پر پہنچ گئے۔ میں آج اس آیت تک آپ حضرات کو ضرور پہنچانا چاہتا تھا۔ چونکہ گفتگو کا آغاز "شَرَعَ لَكُمْ" سے ہوا تھا۔ اس آیت کے پہلے حصّہ میں بھی یہی مضمون ایک دوسری اہم بات کی وضاحت کے لئے آرہا ہے اور اس کا آیت نمبر ۱۳ سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ فرمایا:

اَمۡ لَهُمۡ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوۡا لَهُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا لَمۡ يَاۡذَنۡۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ

کیا ان لوگوں کے لئے (اللہ کے) کچھ ایسے شریک ہیں جنہوں نے ان کے لئے از قسم دین از قسم نظامِ حیات اور دستورِ زندگی کوئی ایسا طریقہ مقرر کر دیا ہے ایسی شریعت دی ہے جس کا اللہ نے حکم یا اذن نہیں دیا ــــــ؟"

آیت کے حصّہ کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہوگی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توحید کی اور اسی توحید پر مبنی دین قائم کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ آپؐ کے مخاطبین جو اب مخالفین بن گئے ہیں، وہ کون ہیں؟ ایک طرف مشرکین، ایک طرف اہلِ کتاب۔ اہلِ کتاب کے بارے میں تو گفتگو تفصیل سے ہو چکی۔ البتہ مشرکین کے بارے میں بات کا ایک حصّہ چھوڑ دیا گیا تھا وہ یہاں کی جارہی ہے اور ان سے بھی گفتگو کی تکمیل یہاں ہو رہی ہے ـــــ وہ یہ ہے کہ دنیا میں شرک کے نظام میں یہ بات ملے گی کہ ہر نظامِ شرک میں کچھ دیویاں، کچھ دیوتا، کچھ چھوٹے خدا تو بنا دیئے جاتے ہیں لیکن آج تک کسی دیوی یا دیوتا کا بھیجا ہوا کوئی صحیفہ، کوئی شریعت کوئی کتاب کہیں نہیں ہے۔ وہ بہت سی دیویوں اور دیوتاؤں کو پوج رہے ہیں لیکن کیا وہ اس کے مدّعی ہیں کہ ہمارے پاس فلاں دیوی یا دیوتا کا دیا ہوا یہ صحیفہ ہے۔ ہندوؤں سے پوچھ دیکھئے وہ کسی دیوی دیوتا سے کوئی صحیفہ منسوب کر ہی نہیں سکتے۔ اس لئے کہ اس کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ عرب کے مشرکین لات، منات، عزّیٰ، ھُبل اور نہ معلوم کن کن ناموں کے بتوں کو پوجتے تھے لیکن ان بتوں نے انہیں کوئی شریعت دی تھی؟ کوئی قانون دیا تھا؟ کوئی نظام دیا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ نہ وہ اس کے مدّعی تھے ــــــ

ثابت یہ ہوا کہ تمام اصنام مشرکین کے اپنے ذہنوں کے تراشے ہوئے تھے۔ اگر ان کی کوئی حقیقت ہوتی تو وہ کوئی نہ کوئی شریعت دیتے۔ کوئی قانون دیتے کوئی ضابطہ دیتے کچھ اصول دیتے۔ کسی شے کو حلال ٹھہراتے اور کسی کو حرام۔۔ اگر واقعی کسی میں الوہیت ہو تو وہ دین دے گا۔ حقیقت ان کی کوئی نہیں۔ اسی لئے یہاں استفہامیہ انداز میں فرمایا اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ کیا ہیں ان کے کوئی ایسے شریک جنہوں نے ان کے لئے وہ شریعت دی ہو، جنہوں نے ان کے لئے وہ نظام تجویز کیا ہو جس کا حکم اللہ نے نہیں دیا؟

موجودہ مشرکانہ و مبتدعانہ افعال پر انطباق

اب آپ غور کیجئے ہمارے یہاں بھی جن جن کو پوجا جا رہا ہے کیا ان کی طرف سے کوئی ہدایت ہے، کوئی صحیفہ ہے، کوئی شریعت ہے۔ کیا انہوں نے وصیّت کی تھی کہ ہماری قبروں کو عبادت گاہیں بنا لینا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ یہ سب صرف اسلئے ایجاد کر لیا گیا کہ: هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ یا یہ کہ لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى۔ اسی کے پیش نظر ان کے مزاروں پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں کہ یہ اللہ کے یہاں ہمارے لئے وسیلہ بن جائیں گے۔ یہ ہمارے لئے سفارشی بن جائیں گے۔ یہ وہاں ہمارا بیڑہ پار لگوادیں گے۔۔ یہ سب کچھ کیا ہے! ان کو قرآن امانی کہتا ہے تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ۔ یہ ان کی تمنائیں ہیں اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ خود کو مسلمان کہنے کے باوجود خود دین پر عمل کریں نہیں اور دل میں ان تمناؤں اور آرزوؤں کی پرورش کرتے رہیں کہ فلاں فلاں اولیاء اللہ ہماری شفاعت کریں گے چونکہ ہم نے ان کے مزاروں کی۔ ان کے مقبروں کی، ان کی درگاہوں کی، ان کے سجادہ نشینوں کی بڑی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ نذرانے پیش کئے ہیں۔ چڑھاوے چڑھائے ہیں۔ ان کی نیاز دی ہے۔۔۔ یہ سب کچھ اس دین اور شریعت کے منافی ہے جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دیا ہے۔ این خیال است و محال است و جنوں

مشرکین دین سے تہی دست ہوتے ہیں

یہ ہے موضوع اور مضمون آیت کے اس حصے کا کہ شرک کے قائل لوگوں کے پاس کوئی شریعت نہیں، کوئی کتاب نہیں، کوئی صحیفہ نہیں، ان کے پاس کوئی نظام نہیں

اس لئے کہ شرک جن ہستیوں کو الوہیّت میں شریک ٹھہراتا ہے ان کی کوئی حقیقت ہے ہی نہیں۔ اَمۡ لَهُمۡ شُرَكٰٓؤُا۔ کیا ہیں ان کے ایسے شرکاء؟ شَرَعُوۡا لَهُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ۔ جنہوں نے ان کے لئے دین میں سے کچھ دیا ہو۔ کوئی ضابطہ، کوئی قانون، کوئی دستور، کوئی شریعت انہیں دی ہو ـــ یہی تو ہیں موجودہ عیسائیت کے متعلق کہا کرتا ہوں کہ یہ دین نہیں ہے محض عقیدہ (DOGMA) بن کر رہ گئی ہے۔ کسی مشرکانہ نظام میں پوجا پاٹ کے کچھ ضابطے اگر ہیں تو وہ پجاریوں اور پنڈتوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ کم از کم ان کو اتنا (CREDIT) ضرور ملتا ہے کہ انہوں نے جھوٹوں بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ ہمارے فلاں دیوی یا دیوتا کا نازل کردہ ہے۔ یا پوجا پاٹ کے فلاں طور طریقے فلاں فلاں دیوی یا دیوتا کے مقرر کردہ ہیں۔ ہندوستان یا قبل ظہورِ اسلام عرب میں کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ فلاں صحیفہ فلاں دیوی دیوتا یا فلاں بت کا نازل کردہ ہے ـــ یہ بات ہے جو آیت زیرِ درس میں بیان ہو رہی ہے۔ اس کے تقابل میں لائیے آیت مبارکہ کے اس حصہ کو جس کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں کہ: اَللّٰهُ الَّذِيۡۤ اَنۡزَلَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ وَالۡمِيۡزَانَ ؕ ـــ اللہ تو وہ ہستی ہے کہ جس نے حق کے ساتھ کتاب اتاری اور میزان اتاری' ـــ تمہیں نظام دیا، تمہیں شریعت دی، تمہیں قانون دیا، تمہیں ایک نظام عدلِ اجتماعی عطا فرمایا۔ اس اللہ کے مقابلہ میں تم جن کو شریک ٹھہرا رہے ہو، ان کی طرف سے دی ہوئی کوئی شریعت، کوئی نظام، کوئی ہدایت سرے سے موجود ہی نہیں ہے ـــ! یہ ہوا مفہوم و مطلب آیت کے اس حصہ کا: اَمۡ لَهُمۡ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوۡا لَهُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا لَمۡ يَاۡذَنۡۢ بِهِ اللّٰهُ ؕ

اجلِ مسمّٰی کے ضابطہ کا اعادہ

آگے چلئے فرمایا:

وَلَوۡلَا كَلِمَةُ الۡفَصۡلِ لَقُضِيَ بَيۡنَهُمۡ ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيۡنَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ■

"اگر آخری فیصلے کے لئے طے نہ ہو چکا ہوتا تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا اور یقیناً ان ظالموں کے لئے دردناک عذاب ہے۔"

اب ان مشرکوں کے متعلق اسی سنّت اللہ کے بیان کا اعادہ ہو رہا ہے جو اہلِ کتاب کے بارے میں بایں الفاظ فرمایا گیا تھا جس کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں : وَ لَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ـــــ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں پیدا ہونے والے تمام انسانوں کے لئے جہاں ایک مہلت عمر اور مہلت عمل مقرر کر رکھی ہے، وہاں اس دنیا کے آخری انجام یعنی الساعۃ (قیامت) کے لئے بھی اپنے علم ازلی میں ایک وقت طے کیا ہوا ہے۔ اس کا علم اس نے کسی کو نہیں دیا : يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ۝ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ۝ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ۝ "(اے نبیؐ) یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ قیامت کی گھڑی کب آ کر ٹھہرے گی! آپ کا کیا کام کہ اس کا وقت بتائیں۔ اس کا علم تو اللہ پر ہی ختم ہے"! اور جیسے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ "قیامت کی گھڑی کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے" لہٰذا یہاں مشرکوں سے کہا جا رہا ہے کہ اگر آخری گھڑی کا پہلے سے وقت اللہ کے علم میں طے ہو چکا ہوتا تو تمہارا بھی قضیہ چکا دیا جاتا ـــــ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں اکثر و بیشتر ظلم کا لفظ شرک اور ظالمین کا لفظ مشرکین کے لئے آتا ہے جیسے : اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۔

درس کا خلاصہ

اختتام سے قبل میں چاہوں گا کہ آج ان آیات کے مطالعہ سے جو اہم باتیں ہم[ا] سامنے آئی ہیں، ان کو بطور خلاصہ آپ کے سامنے انتہائی اختصار کے ساتھ رکھ دوں[ا] اقامتِ دین کا حکم ہمارے سامنے سورۂ شوریٰ کی عظیم ترین آیت نمبر ۱۳ کے ذری[عے] آیا: اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ ۔ اس امر کی تاکید بھی آئی کہ اقامتِ دین کے بارے میں تف[رقہ] میں نہ پڑنا : وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۔ مزید برآں اس درس کے ذریعے ہمارے سامن[ے] امور آئے کہ اس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں دو گروہ تھے ۔ مشرکین اہلِ کتاب ۔ ان دونوں کا طرزِ عمل پھر ان دونوں کے بارے میں حضورؐ کے لئے رہنما[ئی] بھی ہمارے سامنے آئی ـــ پھر حضورؐ کو اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی کے لئے کمربستہ ہو[نے کا] حکم ـــ اپنے موقف پر جم جانے، ڈٹ جانے اور مستقیم ہو جانے کی تاکید ۔ حضورؐ سے

اس امر کا اعلان کہ مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے مابین نظامِ عدل و قسط قائم کر دوں : وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ ۔ بھی ہمارے سامنے آیا ـــــ ان تمام امور کے پردے میں تاقیامِ قیامت اہلِ ایمان کے لئے رہنمائی اور ہدایت آئی ہے کہ ہمارے آخری رسولؐ کے امتی ہونے کی حیثیت سے اقامتِ دین، عدل و قسط پر مبنی نظامِ اجتماعی اور اجتماعی توحید کا قیام و نفاذ ہر مدعیٔ ایمان پر لازم ہے، واجب ہے، فرض ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس کام کے لئے جدّ و جہد کا بیڑا اٹھالیں ان کو ان آیات سے مکمل رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے۔ جس عظیم کام کے لئے اللہ کے رسول مبعوث ہوتے رہے، انؑ کو بیّنات عطا ہوتی رہیں، انؑ کو کتبِ سماوی اور شریعتِ الٰہیہ عطا ہوتی رہی کہ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ـــــ نبوّت و رسالت کے آنحضورصلی اللہ علیہ وسلم پر اتمام و اکمال اور اختتام کے بعد اب یہ کام امتِ مسلمہ کے ذمّہ ہے ـــ جو لوگ منہاجِ نبوّت کے مطابق فریضہ اقامتِ دین کے لئے کمر کس لیں ان کے لئے ان آیات میں تمام اصول عطا کر دیئے گئے ہیں۔

میں نے ارادہ کیا تھا کہ آج ان شاء اللہ آیت نمبر ۱۳ سے آیت نمبر ۲۱ تک کل نو آیات کا مطالعہ مکمل ہو جائے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے فضل سے مجھے ہمت دی کہ جیسے بھی ہو سکا میں نے بیان مکمل کر لیا اور آپ کو بھی ہمت دی کہ آپ نے نہایت سکون اور صبر و ثبات کے ساتھ یہ ساری باتیں سن لیں۔ میں اس بات کا پھر اعادہ کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کا جو بھی حقیر سا فہم مجھے عطا فرمایا ہے اور مجھے مطالعۂ قرآن مجید ـــــ کا جو موقع مرحمت فرمایا ہے، اس کی رو سے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ میرے نزدیک اقامتِ دین کے موضوع پر سورہ شوریٰ کی آیت ۱۳ ۔ ۱۴ ۔ ۱۵ قرآن مجید کی اہم ترین آیات ہیں ـــــ آج کا یہ اجتماع دعا کے ساتھ اختتام پذیر ہوتا ہے۔ کل ان شاء اللہ ہم اسی سورہ شوریٰ کی آیت نمبر ۳۶ سے آیت نمبر ۵۰ تک کا مطالعہ کریں گے۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَآئِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ ط وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ـــــ!

توحید عملی

درس ثانی سورہ شوریٰ

از آیات ۳۶ تا ۵۰

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فَمَآ اُوتِیتُم مِّن شَیۡءٍ فَمَتَاعُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَمَا عِنۡدَ
اللّٰہِ خَیۡرٌ وَّاَبۡقٰی لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَلٰی رَبِّہِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَ ﴿۳۶﴾ وَ
الَّذِیۡنَ یَجۡتَنِبُوۡنَ کَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَالۡفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوۡا ہُمۡ
یَغۡفِرُوۡنَ ﴿۳۷﴾ وَالَّذِیۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّہِمۡ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ
اَمۡرُہُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَہُمۡ وَمِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِیۡنَ اِذَآ
اَصَابَہُمُ الۡبَغۡیُ ہُمۡ یَنۡتَصِرُوۡنَ ﴿۳۹﴾ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثۡلُہَا
فَمَنۡ عَفَا وَاَصۡلَحَ فَاَجۡرُہٗ عَلَی اللّٰہِ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۴۰﴾
وَلَمَنِ انۡتَصَرَ بَعۡدَ ظُلۡمِہٖ فَاُولٰٓئِکَ مَا عَلَیۡہِمۡ مِّنۡ سَبِیۡلٍ ﴿۴۱﴾ اِنَّمَا
السَّبِیۡلُ عَلَی الَّذِیۡنَ یَظۡلِمُوۡنَ النَّاسَ وَیَبۡغُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ
الۡحَقِّ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۴۲﴾ وَلَمَنۡ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ
لَمِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ﴿۴۳﴾ وَمَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنۡ وَّلِیٍّ مِّنۡ

بَعْدِهٖ ۭ وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ
مِّنْ سَبِيْلٍ ۴۴ وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ
مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ۭ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا
اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ۴۵
وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَاۗءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ
اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ۴۶ ۭ اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ
لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَىِٕذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ۴۷
فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۭ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ
وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ
بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ۴۸ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ
الذُّكُوْرَ ۴۹ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَاۗءُ عَقِيْمًا ۭ اِنَّهٗ
عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۵۰

مندرجہ بالا آیات کی تلاوت اور ادعیہ مسنونہ کے بعد فرمایا:

کل ہم نے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے سورۂ شوریٰ کی نو آیات از ۱۳ تا ۲۱ کا مطالعہ مکمل کرلیا تھا۔ آج اسی سورۂ مبارکہ کی پندرہ آیات از ۳۶ تا ۵۰ کا مطالعہ پیشِ نظر ہے۔ میری کوشش ہوگی ان آیات کا مطالعہ آج کی نشست میں مکمل ہوجائے۔ لیکن کوشش میری ہوگی۔ اس کو کامیاب فرمانا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے: اَلسَّعْیُ مِنَّا وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ۔

مجھے یہ احساس ہے اور جس طرح میرا دل کٹ رہا ہے کہ ہم نے سورہ شوریٰ کی بہت سی آیات کو اس وقت چھوڑ دیا انہیں مطالعہ میں شامل نہیں کیا۔ ابتدائی۔ بارہ

آیات پھر درمیان میں آیات ۲۲ سے ۳۵ تک پھر آخری تین آیات از ۵۱ تا ۵۳ زیرِ درس نہ آسکیں۔ اس کی وجہ آپ کے علم میں ہے کہ اعلان یہی کیا گیا تھا کہ سورہ شوریٰ اقامت دین کے موضوع پر قرآن مجید کا ذروۂ سنام ہے، اس کی چوٹی ہے اور ہم اس سورت کے انہی مقامات کا مطالعہ کریں گے جو خاص طور پر اس موضوع سے متعلق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی تقریر میں مکّی سورتوں کے مضامین کے بارے میں چند عمومی باتیں عرض کر دی تھیں۔ چند چھوٹی چھوٹی سورتوں کو چھوڑ کر بقیہ مکّی سورتوں میں جو حجم کے اعتبار سے بڑی ہیں چند مضامین تو سب میں مشترک ہیں۔ جیسے ایمانیاتِ ثلاثہ، توحید کا بیان، آخرت کا بیان اور اس کے ذیل میں جنّت و دوزخ کا ذکر، یوم قیامت کے شدائد و مصائب کا ذکر، رسالت کا بیان اور اس ضمن میں قصص الانبیاء و انباء الرسل ـــ یوں سمجھ لیجئے کہ چند مستثنیات کے سوا کوئی مکّی سورت ہو نہیں سکتی جو ان مضامین سے خالی ہو۔ بعض دلائل، بعض استشہادات اور استدلالات وہ ہیں جو مشترک ہیں اور بار بار دہرا دہرا کر آتے ہیں ـــ پھر میں نے عرض کیا تھا کہ بنیادی اخلاقیات کا ذکر بھی آپ کو اکثر مکّی سورتوں میں ملے گا۔ ان میں شریعت کے احکام نہیں ہیں۔ البتہ بنیادی اخلاقیات کی تعلیم ہے ـــ ویسے یہ کہ ہر سورت کا اپنا ایک رنگ بھی ہے، کسی میں توحید کا رنگ زیادہ نمایاں اور غالب ہے، کسی میں رسالت کا مضمون تفصیل سے بیان ہوا ہے، کسی میں آخرت کا ذکر زیادہ شرح و بسط کے ساتھ آیا ہے۔ یہ باتیں میں ابتدائی تقریر میں آپ کے سامنے عرض کر چکا ہوں۔

اس سورہ کا دوسرا اہم موضوع

اس سورہ مبارکہ میں دو خصوصی مضامین آئے ہیں۔ حکمت دین کے اعتبار سے ایک بڑا اہم مضمون بھی اس میں وارد ہوا ہے۔ میں نے اس پر گفتگو نہیں کی ہے۔ اس مضمون کے اعتبار سے بھی سورہ شوریٰ قرآن مجید کی اہم ترین سورت ہے۔ وہ موضوع ہے "حقیقتِ وحی اور اقسامِ وحی"۔ حروف مقطعات کے بعد یہ سورت شروع ہی ہوتی ہے وحی کے ذکر سے: كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ؁

"اسی طرح اللہ العزیز الحکیم وحی کرتا ہے آپ کی طرف اے محمد (صلّی اللہ علیہ وسلّم)، اور اسی طرح آپ سے پہلے انبیاء و رسل کی طرف وحی کرتا رہا ہے"

وہی ذاتِ واحد ہے جو معبودِ برحق ہے، زبردست و غالب انتہائی حکمت والا ہے۔

—— پھر اختتام پر جو تین آیات وارد ہوئی ہیں، انکے متعلق جان لیجیے کہ وہ اس موضوع پر نہایت اہم ہیں کہ حقیقت وحی، اقسام وحی اور حقیقت ایمان کیا ہے! ایمان کا منبع و سرچشمہ کیا ہے! وحی کے آغاز سے پہلے نبی کا ایمان کس نوعیت کا تھا! وحی کے آغاز کے بعد اس میں کس چیز کا اضافہ ہوا۔! حکمتِ دین کے اعتبار سے یہ بہت اہم موضوع ہے۔ اور اس موضوع پر بھی سورہ شوریٰ میرے مطالعہ کی رو سے قرآن مجید کا ذروۂ سنام ہے۔ لیکن ان تین دنوں کے درس میں اس موضوع کو میں نے نہیں چھیڑا۔ بہرحال یہ موضوع اپنی جگہ بہت اہم ہے اور میں یہ بھی عرض کر دوں کہ مجھے اس سے ایک خصوصی دلچسپی بھی ہے۔ اپنے اپنے ذوق کے مطابق کسی کو کسی خاص موضوع سے طبعاً مناسبت ہوتی ہے تو حقیقت و اقسام وحی وہ موضوع ہے جس سے مجھے خصوصی شغف ہے اور جسے میرے ذہن سے مناسبت ہے۔ لیکن میں نے اسے جان بوجھ کر چھوڑا ہے۔ اللہ کو منظور ہوا تو پھر کبھی اس موضوع پر درس ہوگا۔ میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ میں نے محسوس کیا۔ میرا دل کٹ رہا ہے تو میں نے سمجھا کہ آپ میں سے بھی بہت سے حضرات کو یہ بات گراں گزر رہی ہوگی کہ اس سورہ مبارکہ کی جو ترتیب ہے اس کو ہم نے کیوں چھوڑا۔! یہ اس لئے ہوا کہ اس مرتبہ میں چاہتا تھا کہ دوسرے خاص موضوع یعنی انفرادی سطح پر توحیدِ عملی اور اجتماعی طور پر اس توحیدِ عملی کا اقامتِ دین کی صورت میں ظہور سے متعلق آیات کا سلسلہ وار مطالعہ کر لیں۔

سورہ کی اہم ترین آیات

میں نے کل عرض کیا تھا کہ اقامتِ دین کے موضوع پر تین آیات از ۱۳ تا ۱۵ اہم ترین آیات ہیں۔ از آدمؑ تا ایں دم دین ایک ہی رہا ہے۔ اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا ہے۔ حضرت نوحؑ کا جناب محمدؐ کا حضرات ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کا دین ایک ہی ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس کو قائم کرو۔ میں کل عرض کر چکا ہوں کہ دونوں مفہوم ہیں اَقِیْمُوا الدِّیْنَ کے۔ دین قائم ہے تو اسے قائم رکھو، اگر قائم نہیں ہے تو اس کو قائم کرو۔ میں نے مثال دی تھی کہ خیمہ کھڑا ہے تو اسے سنبھالے رکھو کہ گر نہ جائے۔ اگر گر گیا ہے تو اس کو کھڑا کرو۔ دونوں ترجمے درست ہیں —— ان آیات کو ایک مرتبہ

پھر سن لیجئے تاکہ ان کی تشریح و توضیح میں میں نے جو کچھ کل عرض کیا تھا اس سے آپ کا ذہنی رشتہ قائم ہو جائے۔ فرمایا:

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ۚ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ ۚ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ ۝ وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكِتَابَ مِن بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ ۝ فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ ۖ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۖ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ۖ وَقُلْ آمَنتُ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِن كِتَابٍ ۖ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۖ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۖ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ۝

یہ تین آیات جن کے متعلق میں بار بار عرض کر چکا ہوں کہ میرے مطالعہ کے مطابق اقامتِ دین کے موضوع پر قرآن مجید کا ذروۂ سنام ہے۔ اس کی چوٹی ہے۔ کل ہم نے انہی کے ساتھ چھ آیات مزید پڑھی تھیں۔ آج آغاز میں جن آیات کی میں نے تلاوت کی تھی آج ہم اللہ کی توفیق کے بھروسے پر ان کا مطالعہ مکمل کرنے کی کوشش کریں گے۔

اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کے اوصاف

اس میں سب سے پہلے تو اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کے اوصاف سامنے لائے جا رہے ہیں کہ ان کو کن اوصاف سے متّصف ہونا چاہیئے۔ کیا یہ ہر کہ و مہ کا کام ہے! کیا اپنی سیرت و کردار کے داغ لے کر بھی کوئی شخص اس میدان میں اتر سکتا ہے۔!! یا یہ کہ جس کی نیّت ہے کہ وہ یہ فریضہ انجام دے کیا وہ اس کے لئے بھی تیار ہے کہ ان اوصاف کو بھی اپنے اندر پیدا کرے۔!

جماعتوں کے تعدّد کا عذر

آگے بڑھنے سے قبل میں چاہوں گا کہ ایک بات کی طرف مختصراً اشارہ کر دوں وہ یہ کہ ہم میں سے اکثر لوگ اس عذر کا سہارا لیتے ہیں کہ ملک میں بہت سی جماعتیں دین کا کام کرنے کی مدعی ہیں، اب کس کا ساتھ دیں! میں نے کل عرض کیا تھا کہ جس طرح ایک پرانے مریض کے علاج کے لئے چار حاذق طبیبوں اور ڈاکٹروں کی پورے خلوص و اخلاص کے ساتھ تشخیص اور تجویز میں اختلاف ہو سکتا ہے، اسی طرح احیائے دین اور اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لئے بھی تشخیص اور طریقِ کار میں فرق ہو سکتا ہے جو فی الواقعہ موجود ہے لیکن اس سے ہمارا فرض تو ساقط نہیں ہو جاتا۔ کھلے دل کے ساتھ ان جماعتوں کا جائزہ لیجئے، ان کی تشخیص اور طریقِ کار پر غور و خوض کیجئے پھر جس جماعت پر دل ٹھک جائے پورے خلوص کے ساتھ اس میں شامل ہو جائیے۔ آپ ان شاء اللہ ماجور ہوں گے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ کسی شخص کو ایک جوتا خریدنا ہوتا ہے۔ تو وہ کتنی دوکانوں کا چکّر لگاتا ہے کتنے جوتے دیکھتا ہے۔ پھر ایک پسند کر لیتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ توحید عملی اختیار کرنا اور اقامتِ دین کے لئے جدّ و جہد کرنا اس پر لازم ہے، واجب ہے، فرض ہے تو وہ دین کے لئے کام کرنے والی جماعتوں کا بغور مطالعہ کرے گا اور جس پر اس کا دل ٹھک جائے گا اس کے ساتھ لگ جائے گا۔ جماعتوں کی کثرت کا عذر درحقیقت دین کے کام سے فراریت ہے، شیطان کا فریب ہے۔ بالکل بے وزن ہے اور عام معنوں میں عذر لنگ ہے —— دین کا کام کیجئے اور یکسو ہو کر کیجئے۔ اپنی اصلاح کو مقدم رکھئے۔ جس جماعت پر دل ٹھک جائے اس میں پوری دل جمعی کے ساتھ شامل ہو جائیے۔ اللہ کے ہاں آپ اپنے خلوص و اخلاص کے باعث ماجور ہوں گے۔

معاشی خوف

آج کی زیرِ درس آیات میں سے پہلی آیت میں جو مضمون آ رہا ہے، سب سے پہلے اس کا جوڑ اس بات سے ملا لیجئے جو کل زیرِ گفتگو آیا تھا۔ میں نے کل عرض کیا تھا کہ اس راہ پر آنے کے لئے انسان کو یہ اندیشہ سب سے زیادہ روکتا ہے کہ کیا کھائیں گے کیا پئیں گے! رزق کا معاملہ اس راہ کی بڑی رکاوٹ بنتا ہے۔ کل ہم نے پڑھا تھا: اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ کیوں فکر کرتے ہو! اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے، وہ تعالیٰ بہت باریک بین ہے، وہ تمہاری ضرورتوں کو تم سے بڑھ کر جاننے والا ہے۔ وہ القوی ہے العزیز ہے —— البتہ طے کرنے

کی بات یہ ہے کہ ہر شخص اپنی جگہ شعوری طور پر فیصلہ کرے کہ اس کا مطلوب دنیا ہے یا آخرت! فیصلہ کُن بات یہ ہے۔ میں آج اس کی طرف توجّہ دلاؤں گا کہ ہر شخص اپنے گریبان میں جھانکے تو اِلّا ماشاء اللہ ہمارا یہ حال ہے کہ رجحان کچھ اِدھر ہے کچھ اُدھر۔ — آخر دین کا دل میں شغف ہے، اس کی طرف کشش ہے تب ہی تو آپ یہاں درس سننے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ مجمع عام لوگوں پر تو مشتمل نہیں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سردی کی راتوں میں دور دور سے چل کر بھی آتے ہیں اور قرب و جوار سے بھی۔ صرف اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب حمید کا درس سنیں۔ بس معلوم ہوا کہ دین سے شغف اور اس کی جانب کشش تو ہے۔ اس کے لئے کام کرنے کی طرف طبیعت راغب اور مائل بھی ہے۔ لیکن جب دنیا کا معاملہ آتا ہے تو دل ڈولنے لگتا ہے۔ قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ آدمی سوچتا ہے کہ اِدھر جاؤں یا اُدھر جاؤں ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

یہ وہ کیفیت ہے جس میں ہم میں سے اکثر مبتلا ہیں۔

فرصت کا انتظار

کبھی کبھی ہم اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں کہ فلاں فلاں ذمہ داریاں ہیں ذرا ان سے نمٹ لیں پھر ہمہ وقت دین کے کام میں لگ جائیں گے — کل میں عرض کر چکا کہ اس سے بڑی خود فریبی اور کوئی نہیں ہے۔ اگر آپ دنیا کے کاموں سے ریٹائر ہو کر دین کے کاموں میں لگیں گے تو اس وقت حال یہ ہوگا کہ توانائیاں اور صلاحیتیں ہی نہیں فہم میں بھی اضمحلال و اختلال آچکا ہوگا یا آنیوالا ہوگا۔ ایک ارذل العمر بھی ہوتی ہے جس کے متعلق قرآن مجید کہتا ہے۔ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا — اکثر بڑے بڑے عالم و فاضل بھی ایک عمر کو پہنچ کر علم و فہم سے بھی خالی ہوجاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ دین کے لئے کام کرنے کا اصل وقت تو وہ ہے جب جسم میں توانائی و قوّت اور فہم و علم میں صلاحیّت موجود ہو۔

محاسبۂ اُخروی

یہ حدیث میں بارہا سنا چکا ہوں جس میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ عدالتِ اخروی میں ہر انسان کو کن کن باتوں کا حساب دینا ہوگا: لَنْ تَزُوْلَ قَدَمَا ابنِ آدم یوم القیامہ من عند ربہٖ حتّٰی یسئال عَنْ خمسٍ۔ ابن آدم کے قدم اس کٹہرے سے ہرگز ہل نہیں سکیں گے جہاں وہ اپنے

رب کے سامنے قیامت کے دن کھڑا ہو گا جب تک کہ اس سے پانچ چیزوں کا حساب نہ لے لیا جائے۔ عَنْ عُمُرِہٖ فِیْمَا اَفْنَاہُ ـــ پوری عمر کا حساب کہ اسے کہاں فنا کیا۔ کہاں کھپایا! ـــ ہم نے تمہیں ستر اسی برس دیئے تھے۔ یہ کہاں گنوائے! وعن شبابہٖ فیما ابلاہ ـــ خاص طور پر شباب کا دور، جوانی کا دور، امنگوں کا دور، قوتوں کا توانائیوں کا دلولوں کا دور جب کہ جسم میں جان ہوتی ہے۔ جب کہ قوائے جسمانی چاق دچوبند ہوتے ہیں۔ پوچھا جائے گا کہ وہ جوانی کے دن کہاں کھپائے اور گنوائے! عمر کے بارے میں دو سوال۔ یہی دو سوال میری موجودہ گفتگو سے متعلق ہیں لیکن جب حدیث کا ذکر آگیا ہے تو پوری سن لیجئے! مال کے متعلق دو سوال: وعن مالہ من این اکتسبہٗ وفیما انفقہٗ۔ مال کمایا کہاں سے تھا، حلال سے یا حرام سے۔ خرچ کہاں کیا تھا! ادائے حقوق میں، دین کی خدمت میں یا عیاشیوں اور اللوں تللوں میں! اور آخری سوال جو درس قرآن کی ہر مجلس میں شرکت کے بعد اور کٹھن ہو جاتا ہے۔ اگر دین کے لئے کچھ کرنے کی نیت نہیں ہے تو یہ نفع کا نہیں گھاٹے کا سودا ہے۔ اگر کچھ کرنے کا ارادہ ہے تو یہ نفع کا سودا ہے ـــ گھاٹے کا سودا کیوں ہے! اس لئے کہ آخری سوال ہو گا: وعما عمل فیما علمہٗ اور جو علم حاصل ہوا تھا اس پر عمل کتنا کیا! آپ نے ایک آیت مزید سمجھ لی اور آپ کے علم میں اضافہ ہو گیا تو آیا اس کے متناسب عمل بھی بڑھا یا نہیں بڑھا! اس کا حساب دینا ہو گا! ـــ یہ ہیں پانچ سوالات جو ہر ابن آدم سے کئے جائیں گے۔ میں نے اس حدیث کو اس وقت اس لئے بیان کیا کہ یہاں بفضلہٖ تعالیٰ جو نوجوان شریک ہیں ان کو معلوم ہو جائے کہ شباب اور جوانی کے متعلق آخرت میں جواب دہی کرنی ہو گی کہ اس کو کن کاموں میں لگایا اور کھپایا ـــ!!

آخرت اور دُنیا کے طلبگاروں کے علیحدہ علیحدہ نتائج!

کل کے مطالعہ میں ہم نے پڑھا تھا: مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ "جو کوئی آخرت کی کھیتی کا طالب ہو گا ہم اس کی کھیتی میں اضافہ کرتے رہیں گے اس کو پروان چڑھاتے رہیں گے اور جو دنیا کی کھیتی

کا خواہش مند ہے اسے ہم اسی میں سے کچھ دے دلا دیں گے۔ لیکن پھر اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے"۔ طے کرنے کی بات یہ ہے کہ آپ کا اصل مقصود و مطلوب کیا ہے؟ مقدم کیا ہے مؤخر کیا ہے؟ آخرت یا دنیا۔ اسی کے مطابق آخرت میں نتائج مرتب ہوں گے ـــــ اسی مضمون سے آج کے درس کا جوڑ ملا لیجئے۔ اس کے ساتھ ہی بتدریج ہمارے سامنے وہ اوصاف بھی آئیں گے جو توحید عملی اور اقامتِ دین کے لئے مطلوب ہیں، فرمایا:

فَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ

جو کچھ بھی تمہیں دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی میں برتنے کا سامان ہے"۔

اس آیت کے پہلے حصے میں دنیا کے سرو سامان کی اصل حقیقت بیان فرمائی گئی ہے۔ یہاں شَیْءٍ نکرہ ہے ـــــ نکرہ تفخیم کے لئے بھی آتا ہے۔ خواہ بڑی سے بڑی چیز دے دی گئی ہو۔ چاہے قارون کا سا خزانہ دے دیا گیا ہو۔ اس دنیا میں کچھ بھی دے دیا گیا ہو اس کے متعلق جان لو کہ فَمَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا۔ وہ اس فانی دنیا کے برتنے کا سامان ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ـــــ تم سمجھتے ہو کہ میری ملکیت ہے، تم سمجھتے ہو کہ میری جائیداد ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ اموال و اسباب دنیا تم کو دوام بخش دیں گے۔ اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝ ـــــ حالانکہ یہ سب عارضی اور فانی ہیں

دنیا کی زندگی کی اصل حقیقت

یاد کیجئے کہ میں نے کل عرض کیا تھا کہ مدنی سورتوں میں سورۂ شوریٰ کے ہم وزن اور مماثل مضامین سورۂ حدید میں آئے ہیں۔ مکی سورتوں میں جو مقام سورۂ شوریٰ کا ہے، مدنی سورتوں میں وہی مقام سورۂ حدید کا ہے۔ اس میں بھی اس حقیقت کو کھول کر بیان کیا گیا ہے کہ اس دنیا کی زندگی کی حقیقت ہے کیا؟ جس پر تم ریجھے ہوئے ہو۔ فرمایا:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِیْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَیْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ یَهِیْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَكُوْنُ حُطَامًا ۭ وَفِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَ

مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ○

یہ دنیا کی زندگی دھوکے کی ٹٹی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس کا ایک حصّہ تو کھیل کود میں بچپن کا گذر جاتا ہے۔ ذرا بڑے ہوئے تو کھیل کود میں تلذذ کی آمیزش شامل اور کچھ سنسنی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ 'لعب و لہو' ہے۔ ذرا اور بڑھے تو بناؤ سنگھار اور ٹیپ ٹاپ کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ اچھے سے اچھا لباس ہو، بالکل فیشن کے مطابق ہو اس سے کہیں بھی ذرا فرق ہوا تو آپ کا دل میلا ہو جائے گا۔ اسے یہاں 'زینت' کہا گیا ہے ۔ اس سے ذرا آگے بڑھے تو دوسروں کے مقابلے میں فخر پیدا ہو جاتا ہے اپنی دولت پر، اپنی نسل پر، اپنی وجاہت و شوکت پر۔ اسے یہاں تَفَاخُرٌۢ بَیْنَكُمْ فرمایا گیا ۔ اس سے ذرا آگے بڑھے، جب ادھیڑ عمری کو پہنچے، بڑھاپے کی سرحد شروع ہوئی تو انسان بڑا واقعیت و حقیقت پسند (REALISTIC) ہو جاتا ہے۔ اب تو خوب دولت چاہیئے، صاحب حیثیت اولاد کی بہتات چاہیئے۔ اسے یہاں فرمایا گیا: تَكَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ میں کہا کرتا ہوں کہ جوانی کا دور وہ ہوتا ہے کہ مونچھ نیچی نہ ہو چاہے سب کچھ چلا جائے۔ اس وقت انسان کو اپنی عزّت کا اتنا پاس ہوتا ہے۔ اور بڑھاپے میں آپ کو نظر آجائے گا کہ اسی شخص کا یہ حال ہوتا ہے کہ مونچھ نیچی کیا نہیں مونڈنے کی نوبت آجائے تو آجائے دولت ہاتھ سے نہ جائے۔ انسان کے یہ مختلف عواطف و میلانات ہوتے ہیں زندگی کے مختلف ادوار میں۔ آخر کار ہوتا کیا ہے کہ انسان کا جسم مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے۔ اس کی رُوح عالم بالا کی طرف کوچ کر جاتی ہے اور یوم آخرت یعنی فیصلہ کے دن کا انتظار کرتی ہے۔ اس کی یہاں مثال دی جیسے بارش کے بعد اس سے اُگنے والے نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہو جاتے ہیں۔ کھیتی پک کر زرد ہو جاتی ہے پھر بھس بن کر رہ جاتی ہے —— یہ ہیں تمہاری دنیا کی زندگی کے مراحل و مدارج ۔

دو انجام

رہی آخرت کی زندگی تو اس میں دو قسم کے انجام ہیں: وَفِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ یا تو دردناک عذاب ہے۔ بہت شدید سزا ہے یا: وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ یا اللہ کی مغفرت ہے اور رضا ہے۔

تذبذب خسارہ کا سودا ہے

اس آخرت کو سامنے رکھو گے تو یہ دنیا کی زندگی ایک

دھوکہ اور فریب کی ٹٹی کے سوا اور کچھ نہیں ـــــ یہی بات یہاں فرمائی جارہی ہے: فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے بڑی سے بڑی چیز جو تمہیں دی گئی ہے تو جان لو کہ یہ اس دنیا کی برتنے کی چیز ہے۔ ملکیت نہیں ہے۔ کسی اور کے لئے یہیں رہ جائے گی۔ ویسے نفس حقیقت الامری تو یہ ہے: لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔ آخر کار پوری نوع انسانی رخت سفر باندھے گی اور وراثت صرف اللہ ہی کے لئے رہ جائے گی۔ جب تک سوچ کا یہ انداز نہیں ہوگا جان لیجئے کہ اقامت دین کی جدوجہد کی وادی میں قدم رکھنا گویا ناسمجھی کی بات ہو جائے گی۔ اس صورت میں تو انسان قدم قدم پر ٹھٹکے گا جس طرح گاڑی چلتے چلتے رک جاتی ہے (KNOCKING کرتی ہے) اسی طرح کا معاملہ ایسے انسان کے ساتھ ہوگا جو یک سو نہیں ہے۔ وہ ایک قدم آگے بڑھائے گا تو دو قدم پیچھے ہٹے گا۔ ذرا آگے بڑھنے کو دل چاہے گا تو دنیا پیچھے کھینچے گی۔ وہ حال ہوگا جس کا نقشہ سورۂ نساء میں کھینچا ہے: مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ یہ منافقین کفر و ایمان کے درمیان ڈانوا ڈول ہو کر رہ جاتے ہیں ـــــ تذبذب میں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ ہدایت کے راستہ پر چلیں یا نہ چلیں۔ اسی کا نقشہ سورۂ حج میں اس طرح کھینچا گیا ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کی بندگی اور پرستش کرنا تو چاہتے ہیں لیکن کنارے کنارے رہ کر۔ منجدھار میں کودنا نہیں چاہتے۔ وہاں خطرہ ہے، اندیشہ ہے۔ اللہ کی راہ میں کنارے کنارے چلنا چاہتے ہیں ـــــ لیکن فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ اگر خیر و خیریت ہو، مالِ غنیمت مل رہا ہو، دولت بھی آرہی ہو تو مطمئن ہیں ـــــ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ط۔ اور اگر آزمائش آگئی، کوئی کٹھن وقت آگیا، قربانی کا مرحلہ آگیا، مال دینا پڑے یا جان کے لئے خطرہ آجائے تو وہ اوندھے منہ گر پڑتے ہیں۔ یہ ہے دنیا اور آخرت دونوں کا گھاٹا، نقصان، خسارہ۔ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝ اور درحقیقت یہی ہے اصل خسران ـــــ

عزم مصمم درکار ہے

مذکورہ بالا کردار آپکو اپنے معاشرے میں انتہائی کثرت سے ملے گا جو یک سو نہیں ہوا ہے۔ ایسے لوگ خال خال ہوں گے جو طے

کر لیں کہ میں تو دراصل طالب آخرت ہوں۔ دنیا ملتی ہے ملے، نہیں ملتی نہ ملے، جتنی ملے میرے رب کی عطا ہے لیکن دنیا کسی درجے میں بھی میرے لئے مطلوب و مقصود کا درجہ نہیں رکھتی۔ دنیا کے لئے سارے عزائم، توقعات (AMBITIONS) ختم کر کے جو شخص اس وادی میں آئے گا وہ ٹھیک ٹھاک چلے گا ___ لہٰذا جو بھی توحید عملی کو انفرادی و اجتماعی زندگی میں نافذ کرنے کی جدوجہد کرنے کا ارادہ کرے اس کا پہلا قدم اور اس میں پہلا وصف یہ ہونا چاہیئے کہ اس کا ایک شعوری اور سوچا سمجھا فیصلہ ہو، عزم مصمم (DETERMINATION) ہو کہ میرے نزدیک دنیا کی زندگی، اس کا مال و متاع، اس کا ساز و سامان آخرت کے مقابلہ میں قطعی ہیچ ہے۔ میری نظر میں اس کی پر کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں ہے۔ اقبال مرحوم کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ

ترجیحات کا مسئلہ

یہی دو چیزیں ہی تو آدمی کو روکتی ہیں۔ سورۂ توبہ کی اس آیت کو ذہن میں لائیے، فرمایا:

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ ۣاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝

"(اے نبیؐ) ان سے کہہ دیجئے اگر تمہیں اپنے باپ، اپنے بیٹے، اپنے بھائی، اپنی بیویاں، اپنے رشتہ دار، اپنے وہ مال جو تم نے جمع کئے ہیں، کمائے ہیں اور اپنے وہ کاروبار جو بڑی محنت سے تم نے جمائے ہیں جن کے کساد کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے اور اپنے وہ مکان جو تم نے بڑے ارمانوں اور چاؤ کے ساتھ بنائے ہیں۔ اگر یہ چیزیں تمہیں محبوب تر ہیں، اللہ سے، اس کے رسولؐ سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تو جاؤ انتظار کرو، گومگو کی کیفیت میں مبتلا رہو ___ (عام فہم زبان میں کہا جائے گا کہ 'جاؤ دفع ہو جاؤ') ___ یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے ___ اور اللہ ایسے

فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا"

جب تک آدمی یہ طے نہ کرلے کہ اس کی ترجیحات کیا ہیں! کام نہیں بنتا۔ اس آیت مبارکہ کی رو سے ہر شخص اپنے دل میں ایک میزان ایک ترازو نصب کرے پھر ایک پلڑے میں آٹھ محبتیں ڈالے اور ایک پلڑے میں تین ـــ آٹھ محبتوں میں سے پانچ کا تعلق ہے رشتہ و پیوند سے۔ باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں اور عزیز و اقارب ـــ یہ ہیں رشتہ و پیوند ـ اور وہ مال جو کمائے اور جمع کیے اور وہ کاروبار جو محنت سے جمائے اور چمکائے اور وہ بلڈنگیں جو بڑے شوق سے تعمیر کرائیں۔ یہ تین محبتیں ہیں مال و دولت دنیا ے

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند   بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ

جب تک آدمی ان بتوں کو نہیں توڑے گا اس وقت تک وہ یہ شعوری فیصلہ نہیں کر سکے گا کہ یہ سب کچھ اس فانی دنیا کا عارضی کھیل اور کھلونے ہیں اور میں دنیا کا طالب ہوں ۔ بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں۔ میں دنیا میں ایک اجنبی اور مسافر کی حیثیت سے رہ رہا ہوں۔ مجھے اس دنیا کی (AMBITION) نہیں ہے۔ جو شعوری طور پر یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ میں تو آخرت و عاقبت کو اپنی منزل سمجھ کر اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے اپنی جد و جہد کا آغاز کر رہا ہوں تو ایسا شخص پھر اللہ کی راہ میں بڑھتا چلا جاتا ہے۔ آدمی رشتہ و پیوند اور مال و دولتِ دنیا کی آٹھ محبتوں کے مقابلے میں تین محبتیں، اللہ کی محبت، اس کے رسولؐ کی محبت اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت ڈالے۔ اگر یہ پلڑا جھک جائے تو فھو المراد لیکن اگر آٹھ محبتیں بھاری پڑ جائیں تو اللہ کی طرف سے جھڑکی ہے : فَتَرَبَّصُوا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ ط اور ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ فاسق قرار دیتا ہے : وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ٥

بہتر اور باقی رہنے والی دولت

اب پھر زیرِ مطالعہ آیت کی طرف رجوع کیجئے! فرمایا: فَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ج وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ٥ " جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض چند روزہ زندگی کا برتنے کا ساز و سامان ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والا بھی"۔ دنیا کا یہ ساز و سامان یا تو آپ کی زندگی میں ہی چلا جائے گا یا یہاں رہ جائے گا اور

آپ یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ بہرحال ایک نہ ایک دن تو جدائی ہو گی۔ جیسے سورۃ قیامہ میں فرمایا: وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ■ نزع کے وقت انسان کو یقین ہو جاتا ہے کہ اب تو جدائی ہے اور جب پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جاتی ہے تو اس وقت انسان یقیناً سوچتا ہو گا کہ چاہے ساری دولت چلی جائے لیکن میں یہاں رہ جاؤں۔ لیکن بہرحال اس دنیا سے جدائی انسان کا مقدر ہے۔ یہاں کی دولت اسے نہیں چھوڑتی ہے۔ رہنے والی دولت وہ ہے جو اللہ کے پاس ہے، وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ "ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ پر توکل و اعتماد کیا، اللہ کے پاس بہت عمدہ اور باقی رہنے والا اجر ہے۔

توکل ایمان کا ثمرہ ہے

یہاں دو باتیں فرمائیں 'ایمان اور اپنے رب پر توکل' — جان لیجئے کہ ایمان کا سب سے بڑا ثمرہ توکل ہے یہ یقین کہ میرے لئے کچھ نہیں ہو گا جب تک کہ اللہ کی توفیق شامل نہ ہو۔ اقامتِ دین کی جدوجہد کی راہ میں قدم بڑھانے والوں میں یہ دوسرا وصف ہونا ضروری ہے۔ اگر اپنی ذہانت، اپنی فطانت، اپنی صلاحیت، اپنی منصوبہ بندی، اپنے زورِ بازو پر تکیہ ہے تو سمجھ لیجئے کہ قدم رکھنے سے پہلے ہی ناکام ہو گئے۔ اپنی قوت کی نفی کرنا یہ ہو گا کہ میرے کئے کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں تو اللہ کی توفیق، اللہ کی تائید، اللہ کی نصرت کے بھروسہ پر اس راہ میں قدم رکھ رہا ہوں — توکل اس کی ذات پر ہے، اپنی ذات پر نہیں اپنے علم پر نہیں، اپنے فہم پر نہیں، اپنی محنت پر نہیں، اپنی مشقت پر نہیں اپنی کوشش پر نہیں۔ کسی شے پر کوئی بھروسہ نہ ہو، صرف اللہ پر ہو۔ یہ بھی جان لیجئے کہ توکل کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہوتا جب تک کسی کام کے لئے دنیا میں جن مادی اسباب کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ سب آپ کے پاس ہوں اور پھر بھی آپ کو یہ یقین نہ ہو کہ ان سے کچھ ہو گا۔ بلکہ یقین یہ ہو کہ ہو گا وہی جو اللہ چاہے گا۔ دیا سلائی آپ کے پاس ہے اور سوکھا کاغذ بھی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ دنیا کا جو قانونِ طبعی ہے اور جو عادی اسباب ہیں وہ رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ آپ ماچس سے کاغذ کو جلا سکتے ہیں لیکن پھر بھی آپ کو یقین رہے کہ میں نہیں جلا سکتا اگر اللہ نہ چاہے۔ اور اگر اللہ چاہے تو دیا سلائی کے بغیر بھی کاغذ جل جائیگا۔

یہ یقین اگر نہیں ہے تو ایمان نہیں ہے۔ پھر تو ایمان ہے مادّی اسباب و وسائل پر جن پر آپ کا اعتماد، تکیہ اور توکّل ہے ۔ انہی پر آپ کا ایمان ہے۔ اگر مادی اسباب و وسائل پر آپ کو بھروسہ اور توکّل ہے ۔ تو درحقیقت آپ مومن بالمادّہ ہیں۔ آپ کا ایمان ہے مادہ پر اور مادّی، عادی اور طبعی قوانین پر ۔ جب کہ توحید یہ ہے : اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ ——— "اللہ ہی وہ ذات ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں کوئی کارساز نہیں لہٰذا اہلِ ایمان پر لازم ہے کہ وہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں "۔ عربی زبان میں حرف جار علٰی عموماً لزوم کے لئے آتا ہے ۔ اور جیسے فرمایا: وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ جو اللہ ہی پر بھروسہ کرے تو اس کے لئے اللہ کافی ہے ۔ وہ ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر انسان کا گمان بھی نہ جاتا ہو ۔ اگر قلبی اطمینان کی یہ کیفیت نہ ہو تو پھر ایمان کہاں ہے۔ توحید کہاں رہی!

آیت کے مفاہیم کا حاصل

اس پہلی آیت میں جو باتیں ہمارے سامنے لائی گئیں ان میں ایک تو یہ ہے کہ دنیا کی نگاہوں میں کوئی وقعت نہ ہو دوسرے یہ کہ ایمان بالآخرۃ اتنا مستحضر ہو کہ اصل منزل آخرت ہی ہو جائے ۔ اور دنیا کا سارا ساز و سامان صرف برتنے کی ایک چیز نظر آئے ۔ استعمال کی چیز ہے اس زائد اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے ۔ تیسری یہ کہ اللہ ہی پر توکّل قائم ہو چکا ہو ۔ اللہ ہی کی رضا اور خوشنودی ہمارا مطلوب و مقصود اور نصب العین بن جائے ___ نصب العین کے لفظ پر مجھے یاد آیا کہ لاہور میں ہماری تنظیم اسلامی کے اجتماع میں حال ہی میں بعض باتیں میں نے واضح کیں۔ جن میں ایک خاص جماعت کی ایک غلطی کی نشاندہی بھی کی تھی کہ جہاں تک نصب العین کے لفظ کا تعلق ہے اوّل تو یہ قرآن و حدیث کا لفظ نہیں ۔ دوسرے یہ کہ دین کا کام کرنے کے لئے ہمیں ہر اس اصطلاح سے بچنا چاہیے جو کتاب و سنّت سے ماخوذ نہ ہو۔ ہمیں اصطلاحات قرآن و حدیث کی اختیار کرنی چاہئیں ۔ مثلاً تصوّف ہے ۔ جبکہ اس کے لئے قرآن اور حدیث میں 'احسان' کی اصطلاح موجود ہے تو اس سے بچئے اور وہ لفظ استعمال کیجئے جو قرآن و حدیث کا ہے ۔ تصوّف کا لفظ مجہول النسب ہے ۔ آج تک طے ہی نہیں ہو سکا کہ یہ لفظ کس زبان کا ہے اور کس لفظ سے بنا ہے ۔ 'تصوّف'

جو مفہوم مراد لیا جاتا ہے اس سے کہیں بہتر طور پر یہ مفہوم 'احسان' ادا کرتا ہے۔ تو اسی کو کیوں نہ اختیار کیا جائے۔ اسی طرح سے نصب العین کتاب و سنّت کی اصطلاح نہیں۔ اس کو ترک کر دینا مناسب ہوگا۔ دوسرے یہ کہنا کہ ایک بندۂ مومن کا نصب العین آخرت میں اللہ کی رضا اور دنیا میں اقامتِ دین ہے، یہ بہت بڑی غلطی ہے نصب العین کے درجہ میں سوائے اللہ کی رضا اور اخروی فلاح کے دنیا کی کوئی چیز نہیں ہونی چاہیئے تب نقطۂ نظر درست ہوگا ــــ اقامتِ دین کے لئے جد وجہد فرض ہے۔ کسی کام کا فرض ہونا اور ہے، جیسے نماز بھی فرض ہے روزہ بھی فرض ہے۔ صاحبِ نصاب پر زکوٰۃ اور صاحبِ استطاعت پر حج فرض ہے۔ احساسِ فرض آپ کو آمادہ کرے کہ آپ ان فرائض کو بجا لائیں اور اقامتِ دین کی جد وجہد میں تن من دھن لگائیں ــــ لیکن ان میں سے کسی چیز کو نصب العین کے درجے میں نہ لے آئیے۔ ایک چیز کو نمایاں کرکے آگے لے آنا ترجیح بلا مرجح ہے۔ لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ اللہ نے جو فرائض عائد کر دیئے ہیں ہمیں ان کو ادا کرنے کے لئے جو بھی ہمارے پاس استعداد و صلاحیت ہے اسے بروئے کار لانا ہے۔ یہ نہ ہو کہ دنیا میں دنیا کی کوئی شے آپ کی نگاہوں میں نصب العین کی حیثیت سے کھُب جائے اور وہ آپ کو کھینچ رہی ہو۔ یہ سامنے کی کشش بسا اوقات بڑی غلطیوں کا ارتکاب کرا دیتی ہے۔ عجلت بھی سوار ہو جاتی ہے۔ سیدھے راستہ سے نہیں پہنچ پاتے تو (SHORT CUT) اختیار کیا جاتا ہے اور انسان (BY HOOK & CROOK) اپنے نصب العین تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ لفظ نصب العین ہی استعمال کرنا ہو تو ہمارا نصب العین آخرت میں اللہ کی رضا کے سوا اور کچھ نہیں ہونا چاہیئے۔ ہاں اللہ کی رضا کے حصول کے لئے اسی کی طرف سے عائد شدہ فرائض اور ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا اور مطالباتِ دین پورے کرنے کے لئے محنت اور سعی کرنا ــــ بالکل دوسری بات ہے۔

نہایت اہم ہدایات و تعلیمات !!

اب اگلی آیت پر نظریں مرتکز کیجئے۔ نہایت اہم باتیں بیان ہو رہی ہیں۔ فرمایا:-

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ■

"اور وہ لوگ جو بڑے بڑے گناہوں سے پہلوتہی کرتے ہیں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں، اور جب انہیں غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں"۔

اس آیت مبارکہ پر بڑے غور و خوض اور تدبر کی ضرورت ہے۔ پہلی آیت میں تین باتیں آئی تھیں۔ تین اوصاف آئے تھے ــــ دنیا کی بے مائگی اور بے ثباتی کا یقین ہونا آخرت کی چیزوں کا خیر اور باقی ہونے پر یقین ہونا۔ اللہ پر ایمان اور توکل ہونا ــــ یہاں بھی تین باتیں آئی ہیں۔ تین ہی اوصاف آئے ہیں۔ کبیرہ گناہوں سے اجتناب۔ فواحش سے پرہیز ــــ غصہ کی حالت میں عفو و مغفرت ــــ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ اس ترتیب کا اصل حسن کیا ہے! ان میں باہمی ربط و تعلق کیا ہے!

کبائر سے اجتناب

اس ضمن میں آج میں آپ کو ایک اہم ترین بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ قرآن مجید میں تین مقامات پر یہ مضمون آیا ہے کہ اگر تم کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے صغیرہ گناہوں سے درگذر فرمائے گا ــــ آگے بڑھنے سے پہلے لفظ اجتناب کو بھی سمجھ لیجئے۔ یہ لفظ باب افتعال میں جنب سے ہے۔ جنب پہلو کو کہتے ہیں۔ اجتناب کے معنی ہوں گے پہلوتہی کرنا، دامن بچانا۔ بچ نکلنا۔ چھوڑ دینا ــــ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کا ذکر قرآن مجید میں تین مقامات پر کیوں اور کس لئے ہے؟ اس سبب کو میں آج سمجھانا چاہتا ہوں ــــ دیکھئے کہ ایک مزاج تو وہ ہوتا ہے کہ اصلاحِ ذات کے لئے آدمی بہت حساس ہو گیا ہے ــــ چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی نہ رہے۔ ہلکے سے ہلکا داغ بھی سیرت و کردار پر نہ رہے ــــ ایسے شخص کی ساری عمر اسی ادھیڑبن میں لگ جائے گی۔ پھر وہ تلاش کر کرکے اور خوردبین لگا لگا کے دامن کے داغ دیکھنے اور انہیں دھونے میں ساری زندگی بتا دے گا ــــ پھر بھی کوئی نہ کوئی داغ رہ جائے گا۔ کوئی شخص کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں آج "کامل" ہو گیا ہوں۔ جس دن اس نے یہ کہا وہ دن اس کی بربادی کا ہے۔ کیسے کامل ہو سکتا ہے! کوئی نہ کوئی بشری اور طبعی کمزوری، کوئی نہ کوئی خطا لگی رہے گی۔ اور وہ زندگی بھر اسی تلاش میں اور اس کو رگڑنے میں لگا رہے گا۔ لہٰذا ایسا شخص کبھی بھی اقامتِ دین کی جد و جہد کی وادی میں قدم نہیں رکھ سکے گا۔ بلکہ اس طرف اس کا دھیان بھی نہیں جائے گا کہ یہ فرائض میں شامل ہے ــــ انسان کے ذہن پر جب مبالغہ کے درجہ میں محض اپنی اصلاح

سیرت کی نحت کی دھن سوار ہو جاتی ہے تو اس کے نتیجہ میں رہبانیت وجود میں آجاتی ہے۔

خانقاہ ایک (INSTITUTION) بن جاتی ہے۔ پھر یہی کام نسلاً بعد نسلٍ ہوتا چلا جاتا ہے کہ دامن پر کوئی چھوٹا سا دھبہ، کوئی چھوٹا سا داغ نہ رہ جائے ـــــ اس وقت کے لاہور کی ایک مثال آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ وہاں ایک بزرگ ہیں۔ میں ان کا ان کے خلوص و نیک نیتی کی وجہ سے احترام کرتا ہوں۔ ان کا اور ان کے مریدین کا یہ عالم ہے کہ نہ تو گوشت کھاتے ہیں کہ پتہ نہیں کہ ذبح کرنے والے نے صحیح ذبح کیا یا نہیں کیا! اس اندیشے کے باعث گوشت نہیں کھاتے پھل نہیں کھاتے اس لئے کہ باغ عام طور پر ٹھیکے پر دیئے جاتے ہیں اور ٹھیکہ پر باغ دینا حرام ہے۔ نہ سبزیاں کھاتے ہیں چونکہ ان میں بھی ٹھیکہ شامل ہوتا ہے۔ لے دے کر چند دالوں اور روٹی پر گزارہ ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کہ کس دلیل سے انہوں نے دالوں اور گیہوں کو حلال کیا ہوا ہے! مجھے تو یہ ڈر ہے کہ اگر میں ان کو جا کر بتا دوں کہ حضرت! یہ جو گندم اور دالیں ہیں، ان کے ایک ایک دانے میں سود پیوست ہے۔ کھاد کی جتنی بھی فیکٹریاں ہیں کیا وہ سودی سرمایہ سے قائم نہیں ہیں! کیا کھاد کے بغیر گندم اور دالوں کا کوئی دانہ وجود میں آتا ہے! جس میں سود رچا بسا ہے۔ آپ خود سوچئے کہ انسان اس طرح کا تقویٰ اپنے اوپر مسلط کر لے تو اس پر زندگی اجیرن ہو جائیگی۔ وہ کام کیا کرے گا۔ یہ ہوتا ہے وہ انتہا پسندانہ اور متشددانہ انداز کہ انسان اپنے دامن کے داغ دھبے ہی دھوتا رہ جاتا ہے۔ دین کے لئے کوئی مثبت کام نہیں کر سکتا۔ باطل کو چھوٹ ملی رہتی ہے کہ اس کو کوئی للکارتا ہی نہیں۔ اس کے لئے میدان کھلا ہے۔ اسی لئے تین جگہ قرآن میں اللہ تعالیٰ بتا رہا ہے کہ موٹی موٹی جو چیزیں ہم نے بتائی ہیں انہیں چھوڑ دو تو چھوٹی چھوٹی خطائیں ہم معاف کر دیں گے ـــــ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ اسے کھلا لائسنس سمجھ لیں اور صغائر کرتے چلے جائیں، معاذ اللہ۔ میں آپ کو جو بات سمجھانا چاہ رہا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ یہ جو انداز فکر ہے کہ مجاہدہ مع النفس ہی ہوتا چلا جائے۔ اسی میں ساری عمر بیت جائے اور طاغوت کو میدان میں للکارنے کی کبھی نوبت ہی نہ آئے۔ دین پامال ہو رہا ہو، اس کا استہزا ہو رہا ہو، تمسخر ہو رہا ہو، شعائرِ دین کا مذاق اڑایا جا رہا ہو لیکن حمیتِ دینی اور غیرتِ ایمانی جوش میں نہ آئے۔ غم و غصہ کی حرارت پیدا نہ ہو۔ باطل اور طاغوتی نظام کو بدلنے کا کوئی داعیہ نہ ابھرے۔ پُر معصیت ماحول میں انفرادی زہد و تقویٰ ہی کو کافی سمجھ

جائے تو یہ درحقیقت منطقی نتیجہ بن جاتا ہے اس متشددانہ اور انتہاپسندانہ نقطۂ نظر کا، کہ آدمی اپنی ذاتی اصلاح اور تقویٰ میں اتنا مستغرق ہو جاتا ہے کہ اسے احساس تک نہیں ہوتا کہ اللہ کا دین کس غربت اور کسمپرسی میں ہے[1]۔

یہاں فرمایا: وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ۔ وہ لوگ جو بڑے بڑے گناہوں سے مجتنب رہتے ہیں — میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ یہ مضمون قرآن مجید میں تین جگہ آیا ہے۔ ایک تو یہ مقام ہے۔ دوسرا سورۂ نساء میں وارد ہوا ہے، اس کی آیت نمبر ۳۱ میں فرمایا گیا: اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۞ (اے اہل ایمان)، اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے باز رہو گے، ان سے مجتنب رہو گے اپنا پہلو بچائے رکھو گے ان سے اپنا دامن پاک رکھو گے جن سے تمہیں منع کیا جا رہا ہے مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ۔ تو جو اور خطائیں ہوں گی، فروگذاشتیں ہوں گی، برائیاں اور غلطیاں ہوں گی، انہیں ہم دھو دیں گے ہم

---

[1] اس موقع پر یہ حدیث بھی پیش نظر رہے جو مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اپنی تالیف "خطبات الاحکام" میں، امام بیہقیؒ کے حوالے سے نقل کی ہے۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اوحی اللّٰہ عزوجل الی جبرئیل علیہ السلام ان اقلب مدینۃ کذا و کذا باھلھا۔ قال فقال یا ربّ ان فیھا عبدک فلانا لم یعصک طرفۃ عین قال فقال اقلبھا علیہ وعلیھم فان وجھہ لم یتمعر فیّ ساعۃ قط۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ فلاں فلاں بستیوں کو ان کے رہنے والوں سمیت الٹ دو۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اس پر جبرئیلؑ نے عرض کیا کہ "پروردگار! ان میں تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے چشم زدن کی مدت بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کی۔" آنحضورؐ

نے فرمایا کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ الٹ ڈالو انہیں پہلے اس پر پھر دوسروں پر اس لئے کہ اس کے چہرے کی رنگت کبھی میری خاطر غیرت و حمیت کی وجہ سے متغیر نہیں ہوئی۔ (مرتب)

انہیں صاف کر دیں گے۔ ہم انہیں تمہارے نامۂ اعمال میں سے ساقط کر دیں گے نُکَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ۔ اور ہم تمہیں داخل کریں گے بڑی عزت اور اکرام والی جگہ میں — وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا — یہاں بھی دیکھئے کبائر سے مجتنب رہنے کا ذکر آیا ہے — سورۂ شوریٰ سے آگے آپ چلیں گے تو مکیات کا جو سلسلہ آئے گا اس میں سورۂ نجم بھی ہے۔ اس میں بھی فرمایا گیا: اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ "جو لوگ بڑے بڑے گناہوں اور بےحیائی، کھلے کھلے قبیح افعال سے مجتنب رہتے ہیں سوائے چھوٹے چھوٹے قصوروں کے"۔ غیر ارادی طور پر کوئی خطا اور لغزش ہو گئی، کہیں پیر پھسل گیا، کبھی دل میں وسوسہ آ گیا، کسی وقت کوئی غلطی صادر ہو گئی تو جان لو کہ: اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ○ (آیت ۳۲) "بلاشبہ (اے نبی) آپ کا رب واسع المغفرۃ ہے، وہ بہت معاف فرمانے والا ہے۔ اس کی مغفرت نہایت وسیع ہے اور اے لوگو! وہ تمہیں اس وقت سے خوب جانتا ہے جب اس نے تمہیں زمین میں سے اٹھایا اور وہ تمہیں خوب جانتا ہے جبکہ تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں جنین کی شکل میں تھے۔ لہٰذا اپنے نفس کے تزکیہ اور پاکی کا دعویٰ نہ کرو۔ اللہ پر اپنے تقویٰ کو نہ جھگارو۔ اپنی پاکدامنی کا رعب نہ گانٹھو۔ وہ خوب جانتا ہے کہ کس کے دل میں واقعی حقیقی تقویٰ ہے" —

یہ بڑا تیکھا انداز ہے خاص طور پر ان لوگوں کے لئے جو باریک سے باریک چھلنیوں سے چھاننے پر آ جاتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس فضا میں سانس لینا بھی اس کے بغیر ممکن نہیں کہ آپ سود (INHALE) کریں۔ سود اس طرح اس فضا میں پیوست ہے کہ وہ سانس کے ذریعے جسم میں لازماً پہنچتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ کوئی سود کھائے یا نہ کھائے اس کے غبار سے نہیں بچ سکے گا۔ (او کما قال) جیسے کبھی (DUST SUSPENSION) ہو جائے، فضا غبار آلود ہو جائے تو خواہی نہ خواہی سانس کے ذریعہ خاک اندر جائے گی کہ نہیں! اسی طرح سے ہمارے موجودہ اقتصادی و معاشیاتی نظام میں سود پیوست اور رچا بسا ہوا ہے —

اصل ضرورت کیا ہے؟ پُر معصیت اور طاغوتی ماحول میں اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ کبائر سے بچو، ان سے بالکلیہ اجتناب کرو۔ ساتھ ہی صغائر سے بھی بچنے کی فکر ہو اور اس نظام کو بدلنے کی کوشش کرو۔ باطل سے پنجہ آزمائی کیلئے میدان عمل میں نکلو، منظّم و متحد ہو کر اسے للکارو۔ خود بھی موحّد ہو اور نظام کو موحد بنانے کے لئے تن من دھن لگا دو اور اگر ضرورت متقاضی ہو تو اللہ کی راہ میں اپنی گردن کٹا کر سرخرو ہو جاؤ۔ دین کا اصل مطالبہ یہ ہے۔ اصل ضرورت یہ ہے۔ اس کا برعکس پہلو یہ ہے کہ توحید عملی کے ذروۂ سنام یعنی اقامتِ دین کی جدوجہد سے تو کنّی کتراؤ۔ اور اپنے دامن کے داغ دھبّے ہی دھوتے رہو، ایک دفعہ کافی نہ سمجھو تو پھر دھوؤ، پھر دھوؤ۔ اس طرح تو اس نظام کو بدلنے کی طرف کبھی توجہ نہیں ہوگی۔ تم داغ دھبوں کو دھونے سے فارغ ہی نہیں ہو سکو گے کہ اس میدان میں آؤ اور باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے للکارو۔۔ یہ ہے اس جگہ پر اس اندازِ بیان کا اصل مطلب وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ

فواحش سے بچنے کی علیحدہ تاکید البتہ یہاں ایک بات نوٹ کیجئے وہ یہ کہ فواحش کا کبائر سے علیحدہ خصوصی ذکر کیوں کیا گیا ہے اور فواحش یعنی بے حیائی کی تمام باتوں سے بچنے کی تاکید علیحدہ کیوں کی گئی ہے! اس لئے کہ انسانی سیرت و کردار بلکہ پورے تمدّن کے بگاڑ کے لئے سب سے بڑا اندیشہ Sex یعنی انسان کا جنسی جذبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید مرد و زن کی شرم گاہ کو 'فرج' کہتا ہے۔ فرج کے معنی ہیں" اندیشہ کی جگہ"۔۔ خطرہ کا مقام" آپ کو معلوم ہے کہ پچھلے زمانے میں شہر کے گرد اگرد بڑی مضبوط فصیل بنائی جاتی تھی۔ دشمنوں کے حملوں سے شہر کے لئے یہ فصیل پناہ گاہ کا کام دیتی تھی۔ اگر کہیں فصیل میں دراڑ پڑ گئی تو یہ اندیشہ کی جگہ ہے۔ دشمن اس کے ذریعہ شہر میں گھس سکتا ہے۔ اس دراڑ کو عربی میں فرج کہتے ہیں۔۔ اسی طریقہ سے انسان کی سیرت و کردار کے لئے سب سے زیادہ اندیشے والی چیز درحقیقت فرج ہے۔ عصمت و عفت کا معاملہ۔ اس کی حفاظت کی قرآن مجید میں بہت زیادہ تاکید ہے[1]۔ چنانچہ آپ دیکھئے،

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں:

سورۂ مومنون کی آیت ۵ تا ۷ اور سورہ معارج کی آیات ۲۹ تا ۳۱ میں (جو ہمارے منتخب نصاب میں بھی شامل ہیں) ایک شوشے کے بغیر بالکل یکساں الفاظ آئے ہیں۔ فرمایا: وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ "وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کی ملک یمین ہوں۔ ان پر ہرگز ملامت نہیں۔ البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہے تو وہی لوگ زیادتی کرنے والے حد سے گزرنے والے ہیں" لہٰذا جہاں کبائر سے بچنا لازم اور ضروری ہے وہاں فواحش سے بچنا بھی لازم اور ضروری ہے۔ چونکہ شیطان کا یہ بڑا کاری وار ہوتا ہے۔ یاد ہے کہ اس نے یہی حربہ پہلے انسانی جوڑے حضرت آدمؑ و حضرت حوّا پر جنت میں آزمایا تھا: يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ "اے بنی آدم ہوشیار رہنا کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں اس طرح فتنہ میں مبتلا کر دے جس طرح اس نے تمہارے والدین کو جنت سے نکلوایا تھا اور ان کے لباس ان پر سے اتروا دیئے تھے تاکہ ان کی شرم گاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھول دے" ابھی اللہ تعالیٰ نے اس جوڑے کو رشتہ ازدواج میں منسلک نہیں کیا تھا۔ لیکن شیطان نے قسمیں کھا کر ان دونوں کو یقین دلایا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور ان دونوں کو پھسلا کر اس درخت کا پھل کھانے پر آمادہ کر لیا جس سے منع کیا گیا تھا جس کے نتیجے میں ان سے جنت کا لباس اتر گیا اور ان کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے ـــــ آج پوری دنیا اسی فحاشی

حاشیہ صفحہ گذشتہ

[1] اسی لئے ایک حدیث میں حیاء کو ایمان کا ایک شعبہ اور ایک دوسری حدیث میں حیاء کو نصف ایمان کہا گیا ہے۔ الحیاء شعبة من الایمان اور الحیاء نصف الایمان۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ تم مجھے دو جبڑوں کے درمیان والی چیز یعنی زبان اور دو ٹانگوں کے درمیان والی چیز یعنی شرم گاہ کی ضمانت دے دو یعنی اس کو اللہ کی مرضی کے خلاف استعمال نہیں کرو گے تو میں تم کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ (مرتب)

بے حیائی، عریانی کی زد میں ہے۔ مادہ پرستی کے شرک کے ساتھ ساتھ عریانی و بے حیائی دجالی فتنوں میں بڑے مؤثر فتن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ اعراف میں حرام چیزوں میں فواحش کو مقدم کیا گیا۔ فرمایا: قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ ...... "(اے نبی) کہہ دیجئے میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ بے شرمی بے حیائی کے کام ہیں، خواہ کھلے ہوں یا چھپے" .... اس آیت میں آگے دوسری حرام چیزوں کا ذکر ہے۔ آیت نمبر ۳۳ ہے۔ گھر جا کر پوری آیت مزید پڑھ لیں۔

فرائض کا ترک کر دینا بھی کبائر میں شامل ہے

کبیرہ گناہوں میں شرک تو وہ گناہ ہے، جس کی کسی طور پر معافی نہیں ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ ۔ باقی کبیرہ گناہوں میں سے چند کا میں ذکر کئے دیتا ہوں ــــ فرائض کو ترک کر دینا، کبائر میں شمار ہو جائے گا۔ نماز چھوڑ دی، یہ کبیرہ گناہ ہے۔ بغیر شرعی عذر کے روزہ نہیں رکھا، یہ کبیرہ گناہ ہے۔ اگر آپ صاحب نصاب ہیں اور زکوٰۃ نہیں دے رہے اور صاحب استطاعت ہوتے ہوئے بھی حج کرنے کی کوشش نہیں کر رہے، یہ دونوں کبیرہ گناہ ہیں ــــ اقامتِ دین کی جدوجہد فرض ہے۔ بالخصوص جن پر اس کی جدوجہد کا فرض ہونا واضح ہو جائے ان کا اس کو ترک کرنا کبیرہ گناہ ہے۔ قتل ناحق ہے۔ سود کا لین دین ہے، زنا ہے، جن چیزوں اور جن کاموں کو کتاب و سنت نے واضح نصوص کے ذریعہ حرام قرار دیا ہے ان میں سے کوئی چیز استعمال یا کوئی کام کرنا تمام فقہی مکاتیب فکر میں ان کو کبائر میں شمار کیا گیا ہے۔ ان سب سے ایک مسلمان کو بالکلیہ اجتناب کرنا لازم ہے۔ ان سے وہ اپنا دامن بچائے اور باقی کی اصلاح کی بھی کوشش کرتا رہے۔ اس بات کا منتظر نہ رہے کہ میں جب اپنی کامل اصلاح کر لوں گا تب میں دعوت و تبلیغ اور اقامتِ دین کی جدوجہد کے لئے میدان میں آؤں گا۔ ایسی صورت میں مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ کبھی بھی اس کی نوبت نہیں آئے گی مہلت عمر یونہی تمام ہو جائے گی۔ قرآن مجید کی دعوت تو یہ ہے کہ کبیرہ گناہوں سے اپنا دامن پاک کر کے میدان میں آؤ۔ باطل کو للکارو۔ اقامتِ دین کی جدوجہد میں شامل ہو جاؤ۔ البتہ فحاشی کی ہر شکل اور ہر نوع سے بچو۔ یہ سب سے زیادہ اندیشہ کی بات ہے۔ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ کا بیان یہاں ختم ہوا اب اس آیت کے آخری حصہ

کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

حالتِ غصہ میں انسب و احسن رویہ

فرمایا: وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝ تیسری ہدایت اور تعلیم اس بات کی دی جا رہی ہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں میں یہ وصف ہونا چاہیے کہ وہ کوئی کام غصہ کی حالت میں نہ کریں ــــ بات آگے جا کر مزید واضح ہوگی، یہ بات نہیں ہے کہ انسان میں غصہ نہ ہو۔ غصہ ہونا بھی ضروری ہے۔ حمیت ہونی بھی ضروری ہے۔ غیرت ہونا بھی ضروری ہے۔ انتقام کا جذبہ ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ بات آگے آئے گی۔ اس لئے کہ ایک تصوّر ہے۔ خانقاہی تصوّر، بدھ مت کے بھکشوؤں کا تصوّر، گوتم بدھ کا دیا ہوا "اہنسا" کا تصوّر۔ اسلام میں مستقل بالذات یہ تصوّرات نہیں ہیں۔ اسلام میں تو اللہ کے لئے اور اللہ کے دین کا بول بالا کرنے کے لئے تلوار ہاتھ میں لینا چوٹی کی نیکی ہے: وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ۔ اور جیسے سورہ صف میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ قرآن بالکل مختلف قسم کے انسان بنانا چاہتا ہے۔ یہ بدھ مت کے بھکشو نہیں ہیں، یہ خانقاہی مزاج کی شخصیتیں نہیں ہیں بلکہ ان کا مزاج کچھ اور ہے۔ آج کے درس سے اس مزاج کو سمجھئے جو اقامتِ دین کی جدوجہد کے لئے درکار ہے۔ وہ کیا ہے ــ! غصہ آئے لیکن حالتِ غصہ میں کوئی اقدام نہ ہو۔ ہوا تو معاملہ غلط ہو جائے گا غصہ آئے تو معاف کر دو۔ ہاں سوچ سمجھ کر جسے کہا جائے گا (COOL MINDEDNESS) کے تحت اگر کوئی سخت قدم بھی اٹھانا پڑے تو اٹھانا ہوگا۔ میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ کتنا بڑا قدم اٹھایا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے۔ حالانکہ ان سے بڑھ کر رحیم شفیق رؤف اور ودود انسانوں میں کون ہوگا۔ آپؐ جو رحمۃ للعلمین بن کر آئے ہیں۔ جن کے متعلق قرآن گواہی دیتا ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ۔ اے نبی یہ تو اللہ کی رحمت ہے کہ آپؐ ان کے حق میں بہت ہی نرم خو ہیں ــــ لیکن وہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جنہوں نے دین کے لئے یہ بھی کیا ہے کہ یہودیوں کے ایک قبیلہ کے جتنے بھی جوان مرد تھے ان کو اپنے سامنے ذبح کرا دیا ــــ بنو قریظہ کا یہ معاملہ ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ اس قبیلہ کی اللہ نے مت مار دی تھی کہ ہتھیار ڈالنے کے بعد

اپنا معاملہ نبی اکرمؐ جیسے رؤف ودود اور رحیم و شفیق ذات کے سپرد کرنے کے بجائے قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم بنانے پر اصرار کیا چونکہ نبی اکرمؐ کے مدینہ ورودِ مسعود سے قبل اس قبیلے کے انؓ سے حلیفانہ تعلقات تھے لہٰذا امید تھی کہ وہؓ ان کا لحاظ رکھیں گے۔ حضرت سعدؓ نے عین یہودیوں کی اپنی شریعت کے مطابق یہ فیصلہ دیا کہ بنو قریظہ کے تمام جوان مرد قتل کئے جائیں اور بقیہ لوگوں کو غلام بنا لیا جائے ـــــ فیصلہ تو ان کا تھا لیکن وہ (EXECUTE) تو اں حضورؐ کے حکم پر ہوا ـــــ رحمۃ للعٰلمینؐ نے یہ فیصلہ نافذ فرمایا لیکن اپنے لئے نہیں دین اللہ کے غلبہ کے لئے ـــــ اقامتِ دین کی جدوجہد میں وہ موقع بھی آیا کہ بدر کے اسیروں کے متعلق حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رائے پیش کی تھی کہ ان میں سے اپنے قریب ترین عزیز کو ہر مومن اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے اکابر صحابہؓ کی رائے کے مطابق ان اسیروں کو فدیہ لے کر رہا کر دیا۔ لیکن بعد میں سورہ انفال میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کی رائے کی تصویب فرمائی ـــــ بہر حال انقلابی عمل میں ایسے مواقع آتے ہیں کہ سختی بھی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن ایک ہے جذبات میں آکر سختی کر جانا۔ یہ درست نہیں ہے۔ غصہ آیا ہو اور اس حالت میں آپ کوئی اقدام کر بیٹھیں تو اکثر غلط قدم اٹھا بیٹھیں گے ـــــ لہٰذا غصہ میں تو معاف کر دینا ہی افضل و احسن ہے۔ جیسے مومنین صادقین کے اوصاف میں فرمایا: وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ ط "یہ لوگ وہ ہیں جو غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہوتے ہیں" ـــــ اس آیت میں اقامتِ دین کی جدوجہد اور توحید عملی کے عاملین کا تیسرا وصف بیان فرمایا کہ "اور جب انہیں غصہ آجائے تو معاف کر دیتے ہیں، درگزر سے کام لیتے ہیں: وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ٥

اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کے مزید مطلوبہ اوصاف

آگے چلئے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والوں کے لئے چار مزید اوصاف کا بیان آرہا ہے۔ فرمایا:

وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ ص وَأَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ ص وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ ■

"اور جو لوگ اپنے رب کے حکم پر لبیک کہتے ہیں، اس کا حکم مانتے ہیں۔ اور نماز قائم کرتے ہیں اور اپنے معاملات باہم مشورے سے چلاتے ہیں اور جو کچھ بھی رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔"

استجابت: قبول کرنا۔ لبیک کہنا اجابت اور استجابت کا لفظ ہم کل کے درس میں اس آیت میں پڑھ چکے ہیں: وَالَّذِیْنَ یُحَآجُّوْنَ فِی اللّٰہِ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتُجِیْبَ لَہٗ ۔ میں نے اس کے مفہوم کو مزید واضح کرنے کے لیے آپ کو سورہ بقرہ کی یہ آیت بھی سنائی تھی: وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ ۔۔۔
اجابت اور استجابت ہم معنی الفاظ ہیں۔ اجابت قبولیت کو کہتے ہیں۔ فارسی کا بڑا پیارا شعر ہے جو میں نے چھٹی جماعت کے کورس میں پڑھا تھا ؎

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید!

اس کا ترجمہ بھی شعر ہی میں ہے ؎

ڈرو مظلوم کی آہوں سے جب اٹھتی ہیں سینوں میں
قبولیت ہے کرتی خیر مقدم چرخ سے آکر!

تو اجابت اور استجابت کے معنی قبولیت کے ہیں۔ سورہ بقرہ کی آیت سے صاف واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ دوطرفہ معاملہ ہے۔ فرمایا گیا: اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ "میں تو ہر پکارنے والے کی پکار سنتا اور قبول کرتا ہوں، جب بھی اور جہاں بھی وہ مجھے پکارے۔" میں نے کوئی خاص وقت مقرر کیا ہوا نہیں ہے۔ کہ بس صرف اس میں انٹرویو ہو سکتا ہے یا درخواست سنی جا سکتی ہے یا پیش کی جا سکتی ہے ۔۔۔ لیکن ایک شرط ہے: فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ "پس میرے بندوں کو بھی تو چاہیے کہ میرا حکم مانیں۔ میری پکار پر لبیک کہیں، میری ہدایات کو قبول کریں اور مجھ پر ایمان رکھیں"۔ یک طرفہ ٹریفک نہیں چل سکتا کہ اپنی باتیں تو مجھ سے منوائیں اور میری نہ سنیں ۔۔۔ اب یہاں دیکھیے فرمایا: وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّہِمْ ۔ "جن لوگوں نے اپنے رب کی پکار پر لبیک کہا، اسے قبول کر لیا"۔ غور طلب بات یہ ہے کہ وہ کونسی پکار ہے جس کا حوالہ یہاں دیا گیا ہے۔ اس سورہ مبارکہ میں

ابھی تک جمع کے صیغہ میں دو حکم آتے ہیں ــــ ہم اس وقت اڑتیسویں آیت پڑھ رہے ہیں۔ ان اڑتیس آیات میں جمع کے صیغہ میں ایک فعل امر آیا ہے اور ایک فعل نہی ــ اور واحد کے صیغہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تین حکم دیئے گئے: فَلِذٰلِكَ فَادْعُ نمبر ایک۔ "آپ اسی کی دعوت دیتے رہیئے"۔ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ "اور ڈٹے رہیئے اجمے رہیئے جیسا کہ آپ کو حکم ہوا" نمبر دو اور وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ "اور کہہ دیجئے کہ میں تو اس کتاب پر ایمان لایا جو اللہ نے اتاری ہے۔" یہ تین حکم ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سورہ مبارکہ میں دیئے گئے ہیں۔ اور امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام یعنی ہمیں خطاب کر کے ایک حکم فعل امر میں آیا اور ایک نہی کا حکم آیا یعنی ایک کام سے روکا گیا: اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ فعل امر ہے "کہ دین کو قائم کرو یا قائم رکھو۔ اور فعل نہی ہے وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ "اس دین کے بارے متفرق نہ ہو۔ دین کو پھاڑ نہ دو۔ دین کو ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دو۔ یہ دو حکم اب تک آئے تھے۔ یہاں ان ہی کے لئے فرمایا جا رہا ہے: وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ "وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کی پکار پر لبیک کہا۔ اسے قبول کر لیا۔ اس آیت میں پہلا وصف آیا پکار پر لبیک کہنا۔

اقامتِ صلوٰۃ

اب آگے اسی آیت میں ان لوگوں کا جنہوں نے اس پکار پر لبیک کہا دوسرا وصف بیان ہو رہا ہے: وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ "اور انہوں نے نماز قائم کی"۔ اب دیکھئے دین اللہ کا ہے اس کو قائم کرنے کے لئے آپ کے دل میں اتنا ہی شدید جذبہ ہوگا جتنی اللہ کی محبت آپ کے دل میں ہوگی۔ فرض کیجئے کہ کوئی دولت کا پجاری ہے اور وہ دن رات اس کے لئے محنت کر رہا ہے تو جتنی اسے دولت سے محبت ہوگی، اتنی ہی وہ محنت کرے گا۔ محبت کم ہوگی تو مشقت بھی کم ہو جائے گی۔ اگر اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لئے جدوجہد کرنی ہے تو اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط رکھنا ہوگا اور تعلق مع اللہ کی مضبوطی کے لئے جو ستون ہے جو عماد الدین ہے وہ ہے نماز۔ لہٰذا فرمایا گیا: وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اور نماز کو قائم رکھا، یہ نماز درحقیقت اللہ تعالیٰ سے تعلق کا ذریعہ ہے۔ اللہ کی یاد کا مؤثر ترین ذریعہ: اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ۔ اللہ کے ساتھ تعلق میں اگر کہیں ذرا کمی آنے لگے تو اسے تازہ کرنے کے لئے نماز ہی سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ حفیظ جالندھری کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

سرکشی نے کر دیئے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں

ایک بندۂ مومن نے اللہ تعالیٰ سے جو عہدِ بندگی استوار کیا ہوا ہے سجدے میں جا کر گویا وہ اس عہد کو از سرِ نو تازہ کرتا ہے ۔ علامہ اقبال کا یہ شعر بھی خوب ہے ؂

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے !!
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

مومن اس دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے بلند تر ہو کر زندگی بسر کرتا ہے ۔ اس کا اصل تعلق صرف اللہ کے ساتھ ہوتا ہے ۔ پس نماز اللہ سے تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ ہے ۔ چنانچہ یہاں بطور وصف فرمایا : وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ ۔

شورائیت آگے چلئے اس آیت میں تیسرا وصف بیان ہو رہا ہے ۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ ۔ اب جو اقامت دین کی جد و جہد کرنی ہے ، کفر سے ٹکرانا ہے ، باطل کا استیصال کرنا ہے ۔ حق کا بول بالا کرنا ہے ، غلبۂ دین کے فریضہ کو انجام دینا ہے ۔ اس کے لئے ایک شرطِ لازم یہ بھی ہے کہ جو لوگ اس کام کے لئے جمع ہوئے ہوں ، منظم ہوئے ہوں ، وہ باہمی مشورے کا نظام قائم کریں ۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ ۔ کسی میں انانیت نہ آنے پائے ۔ اس میں کوئی TOTALITARIANISM نہ ہو کہ بس میں مختارِ کل ہوں ۔ یہ اگر ہو سکتی تھی جو انبیاء و رسل کے لئے ہو سکتی تھی ۔ جن کا تعلق تارِ وحی کے ذریعہ اللہ سے بندھا ہوا ہوتا تھا ۔ جب رسولوں نے یہ نہیں کیا تو ہما شما کس قطار و شمار میں ہو سکتے ہیں ، آپ خود سوچئے ۔ سورہ آلِ عمران میں فرمایا : وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ " (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ان ساتھیوں سے مشورہ لے لیا کیجئے ۔ ان کو بھی مشورے میں شریک کر لیا کیجئے ۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۔ مشورے کے بعد جو آپ فیصلہ کرلیں تو اس پہ اللہ پر توکل کرتے ہوئے عمل کریں ۔ پھر یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ فیصلہ بدل دیا جائے ۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر ۔ دعوتِ توحید عملی کے داعی اور تحریک اسلامی کے قائد کے لئے عزیمت لازمی ہے ۔ مشورہ ضرور کرے پھر فیصلہ کرے ۔ لیکن جب فیصلہ کر لیا جائے تو معاملہ اللہ کے حوالہ کر دیا جائے : فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۔ اسی کی مثال ہمیں غزوۂ احد کے واقعہ میں ملتی ہے کہ نبی اکرمؐ نے مشورہ کیا ہے کہ دشمن مدینہ پر چڑھائی کے لئے آرہا ہے کیا کرنا چاہیئے ! حضورؐ کی اپنی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں محصور ہو کر مدافعت کی جائے جیسے قریباً دو سال بعد غزوۂ احزاب کے موقع پر ہوا تھا ۔

عجیب بات یہ ہے کہ عبداللہ ابن ابی رئیس المنافقین کی رائے بھی یہی تھی۔ رائے میں تو اتفاق ہو سکتا ہے۔ چاہے کوئی شخص نیک نیتی سے رائے دے رہا ہو یا بدنیتی سے۔ لیکن کچھ مسلمانوں نے خاص طور پر انہوں نے جو غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے یا بعد میں اسلام لائے تھے۔ جن میں جوش جہاد بہت تھا، اصرار کیا کہ ہم قلعہ بند ہو کر مدافعت کیوں کریں؟ ہمیں تو شہادت مطلوب ہے

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن　　نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

تو کیوں نہ میدان میں جا کر کفر سے مقابلہ کریں! نبی اکرمؐ نے اپنے چند ساتھیوں کا جب یہ جوش و خروش دیکھا تو فیصلہ فرما دیا کہ ٹھیک ہے میدان ہی میں مقابلہ ہوگا۔ اس کے بعد آپؐ حضرت عائشہ کے حجرہ میں تشریف لے گئے اور باہر وارد ہوئے تو زرہ پہنی ہوئی اور ہتھیار لگائے ہوئے تھے۔ یہ بڑی غیر معمولی بات تھی" آپؐ نے کبھی یہ صورت اختیار نہیں کی تھی۔ اب ان ساتھیوں کو احساس ہوا جن کا میدان میں مقابلہ کرنے پر اصرار تھا کہ ہم سے غلطی ہوئی ہے۔ کوئی خاص بات ہے جو حضورؐ زرہ پہن کر تشریف لائے ہیں۔ انہوں نے کہا حضورؐ ہم اپنی بات واپس لیتے ہیں۔ اب جو بھی آپؐ کا فیصلہ ہو ــــ حضورؐ نے فرمایا "کسی نبی کے لئے یہ زیبا نہیں ہے، اس کے شایانِ شان نہیں ہے کہ ہتھیار لگا کر اتار دے ــــ حضورؐ نے میدان ہی میں چلنے کا فیصلہ برقرار رکھا۔ توکل تو اللہ پر ہے ہوگا وہی جو وہ تعالیٰ چاہے گا ــــ وہ تعالیٰ چاہے تو ہماری غلطیوں کو بھی CONDONE کر دے، ان کی تلافی فرما دے۔ بلکہ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ غلطی آپ کے حق میں مفید ہو جاتی ہے فیصلہ تو اس تعالیٰ کا ہوتا ہے۔ یہ بات ہے جو یہاں فرمائی گئی کہ اے نبی یہ تو اللہ کا بڑا فضل اور اس کی رحمت ہے کہ آپؐ اپنے ساتھیوں کے حق میں بہت نرم خو ہیں: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ـ اگر آپؐ تند خو ہوتے: وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ ــــ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ یہ آپ کے ارد گرد سے منتشر ہو جاتے ــــ اقبال نے کہا ہے ؎

کوئی کارواں سے چھوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی

کسی قافلہ کو لے کر چلنے کے لئے قائد میں خوئے دل نوازی بھی ضروری اور جناب محمد رسول اللہ میں یہ وصف اپنے عروج پر تھا کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ حضورؐ کی سب سے زیادہ عنایت میری طرف ہے سب سے زیادہ توجہ میری جانب ہے ــــ تو فرمایا اگر خدانخواستہ آپؐ کا طرزِ عمل یہ ہوتا کہ آپؐ تند مزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ سب ساتھی ادھر ادھر بچھڑ چکے ہوتے، منتشر ہو چکے ہوتے۔

___ فَاعْفُ عَنْهُمْ ان کی خطاؤں سے درگذر کیا کیجئے ___ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ اور اللہ سے بھی ان کے لئے استغفار کیا کیجئے ___ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہا کیجئے ___ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ اور جب آپؐ فیصلہ کرلیں تو پھر اللہ پر توکّل کیجئے ___ آیات زیرِ درس میں فرمایا: وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ___ یہ اس لئے کہ ایک قافلہ، ایک جماعت، ایک تنظیم کے ہم مقصد ساتھیوں میں ایک دوسرے کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی اور یک جہتی ہونی لازم ہے۔ وہ پیدا نہیں ہوگی اگر مشورہ نہ ہو۔ اور جیسا کہ میں نے کہا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے فرمایا گیا کہ مشورہ لیا کیجئے: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ___ تا بہ دیگراں چہ رسد! دوسرا کون کہہ سکتا ہے کہ میں مشورہ سے مستغنی ہوں ___ لہٰذا ہمیشہ ہمیش کے لئے طے فرما دیا گیا: وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ۔

انفاق کا وصف

اب اس آیت کے آخر میں اقامتِ دین کا فریضہ انجام دینے والوں کا چوتھا وصف بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا: وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۝ "ہم نے انہیں جو بھی رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں" آیت کے حصہ کی توضیح و تشریح سے قبل اب تک ہم نے جو مطالعہ کیا ہے، اس پر نگاہِ بازگشت ڈال لیجئے۔ پہلی آیت میں تین اوصاف بیان ہوتے تھے۔ دنیا کو صرف برتنے کی چیز سمجھنا، نمبر ایک ___ آخرت کی زندگی ہی کو اصل خیر اور باقی رہنے والی شے جاننا، نمبر دو ___ اللہ تعالیٰ ہی پر توکّل کرنا، نمبر تین ___ دوسری آیت میں بھی تین اوصاف آئے۔ کبیرہ گناہوں سے اجتناب، نمبر ایک ___ فواحش سے پرہیز، نمبر دو ___ غصّہ کی حالت میں عفو و درگذر سے کام لینا، نمبر تین ___ زیرِ درس آیت میں اب تک تین اوصاف ہمارے سامنے آتے ہیں۔ دعوتِ اقامتِ دین پر لبیک کہنا، نمبر ایک ___ نماز کو قائم رکھنا، نمبر دو ___ اور اپنے معاملات میں مشاورت کرنا، نمبر تین ___ گویا اب تک نو اوصاف ہمارے سامنے آچکے ہیں، اب دسواں وصف سامنے آرہا ہے اور وہ ہے: وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ؕ ہم نے انہیں جو بھی رزق دیا ہے، وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یہاں تک دس اوصاف پورے ہوتے ہیں۔

چونکہ اکثر لوگ بنیادی باتوں سے واقف نہیں ہیں اس لئے ان کے ذہن کی رسائی یہاں پر خرچ کرنے "يُنْفِقُونَ" کے اصل اور حقیقی مفہوم تک نہیں ہو پاتی۔ دیکھئے خرچ تو سب ہی لوگ کرتے ہیں۔ دولت ہے، کمائی ہے، وہ آخر خرچ کرنے کے لئے ہی ہوتی ہے ___

بخیل سے بخیل آدمی بھی آخر کچھ نہ کچھ خرچ کرتے ہیں۔ بنیوں کو بھی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ خاص طور پر اپنی بیٹیوں کی شادی کے مواقع پر تو وہ دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ مکان بناتے ہیں تو بھی دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ ایک ہے اپنی ذات پر، اپنی ضروریات پر خرچ کرنا۔ وہ یہاں مراد نہیں ہو سکتا، چونکہ اس مقصد کے لئے تو سب ہی خرچ کرتے ہیں ۔۔ یہاں اصل مراد ہو گی۔ اللہ کے لئے خرچ کرنا ۔۔ پھر اللہ کے لئے خرچ کرنے کی بھی تین مدیں ہیں۔ ۔۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ اللہ کو راضی کرنے کے لئے آپ اپنا مال خرچ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی ایک مد ہے ذوی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین، فقراء، بیوگان، مسافروں کی مدد کرنا ۔۔ سائلوں کو دینا۔ جو مقروض ہوں۔ ان کو قرض سے نجات دلانا، جو غلامی کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہوں ان کی گردنیں چھڑا دینا۔ جیسا کہ آیت برّ (سورہ بقرہ کی ۱۷۷ ویں آیت) میں فرمایا: وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ۔ اس مد کو قرآن مجید کی اصطلاح میں صدقات و خیرات نافلہ کہا جاتا ہے۔ زکوٰۃ کو بھی اس میں شامل کر لیجئے وہ فرض ہے اور یہ دوسری مد ہے۔ اس کی مدات اکثر تو یہی ہیں جو آیت بر میں بیان ہوئیں۔ کچھ کا ان میں اضافہ ہے۔ ایک تیسری مد ہے اور وہ ہے اللہ کے دین کے لئے خرچ کرنا۔ دین کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت میں پیسہ لگانا۔ اقامتِ دین کی جد و جہد کے لئے اپنا مال خرچ کرنا۔ اگر بالسیف قتال فی سبیل اللہ کا مرحلہ آ جائے تو اس کے لئے سرو سامان، اسلحہ وغیرہ کی فراہمی میں دل کھول کر پیسہ خرچ کرنا۔ یہاں درحقیقت یہ تیسری مد مراد ہے۔ چونکہ سیاق میں اقیموا الدین کا حکم آ چکا ہے۔ اس لئے کہ اقامتِ دین کا فریضہ کیسے انجام پائے گا۔ اگر مال خرچ نہیں کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں جہاد کا ذکر آیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ وہاں مال کا ذکر مقدم ہو گا۔ جیسے سورہ حجرات میں سچے مومنین کے اوصاف بیان ہوئے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ سورۂ صف میں فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ۔۔ سورۂ توبہ میں فرمایا: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا

وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ اَعْظَمُ دَرَجَۃً عِنْدَ اللّٰہِ ط
— جہاد میں مال خرچ ہوتا ہے بلکہ دعوت و تبلیغ کے مرحلہ پر تو مال ہی خرچ ہوگا۔ آگے جاکر اقامتِ دین کی جد و جہد میں وہ مرحلہ بھی آسکتا ہے کہ نقدِ جان ہتھیلی پر رکھو اور میدان میں آجاؤ۔ کفن سر سے باندھو اور باطل کے مقابلہ میں نکلو — اس مرحلہ کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ کی راہ میں شہادت کی تمنا ہر دل میں ہونی لازم ہے۔ اگر یہ آرزو بھی دل میں نہ ہو" — ہوسکتا ہے کہ یہ مرحلہ آپ کی زندگی میں درپیش نہ ہو۔ اقامتِ دین کی جد و جہد آپ نے شروع کی ہے لیکن قتال بالسیف کا مرحلہ آپ کی زندگی میں نہیں آیا تو کوئی بات نہیں مگر نیت، ارادہ اور تمنا و آرزو دل میں رہے — اللہ کی راہ میں شہادت کی تمنا سے جو سینہ خالی ہے اس کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا: نَقَدْ مَاتَ عَلٰی شُعْبَۃٍ مِّنَ النِّفَاقِ۔ ایسے شخص کی موت ایک قسم کے نفاق پر آئی۔ وہ ایک نوع کے نفاق پر مرا۔ پس جان لیجئے کہ اللہ کے دین کے لئے مال خرچ کرنے کے لئے اصطلاح آتی ہے "انفاق فی سبیل اللہ"۔ یہاں بھی یہی اصطلاح استعمال ہوئی۔ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ■ ایک اور بات بھی اس مقام پر سمجھ لیجئے۔ رزق کا اطلاق صرف مال یا ضروریاتِ زندگی پر نہیں ہوتا بلکہ توانائیوں، صلاحیتوں اور قوتوں پر بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح "انفاق" بھی جامع اصطلاح ہے۔ اس کا اطلاق اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کے ساتھ اپنی توانائیاں، صلاحیتیں اور قوتیں صرف کرنے پر بھی ہوگا۔
اس آیت میں چار اوصاف بیان ہوئے۔ وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّھِمْ، وہ لوگ جنھوں نے اپنے رب کی پکار پر لبیک کہا۔ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ، اور اللہ سے اپنے تعلق کو قائم رکھنے کے لئے نماز کو قائم رکھا — وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ، جماعتی زندگی کے اندر ہم خیالی اور باہمی اعتماد کی فضا برقرار رکھنے کے لئے باہمی مشورے کے نظام اور اس کی روح کو قائم کیا — وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ط۔ اور جو کچھ بھی رزق اللہ نے ان کو دیا ہے اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

بدلہ اور قصاص کے حکم و صبر اور عفو کا محل و مقام

اب آگے پانچ آیات آرہی ہیں، وہ ایک ہی موضوع اور مضمون سے متعلق ہیں، اس

کو اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ یہاں پر یہ مضمون بڑا عجیب ہے۔ عام طور پر یہ تو قابلِ مدح و تعریف بات سمجھی جاتی ہے عفو، درگذر، معافی ـــــ

بدلہ لینے کی حکمت: یہاں اس کے برعکس معاملہ آ رہا ہے فرمایا: وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۔ اور وہ لوگ کہ جن پر جب زیادتی کی جائے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ مقابلہ کرتے ہیں" معلوم ہوا کہ یہاں بالکل ہی رنگ بدل گیا۔ یہاں بدھ مت کے بھکشوؤں والا رنگ نہیں ہے۔ یہاں تو رنگ کچھ اور ہے۔ یہاں تو بطور وصف بتایا جا رہا ہے کہ وہ لوگ جن پر زیادتی ہو، وہ ایسے بے غیرت و بے حمیت نہیں ہیں اور نہ ہی ایسے نرم چارہ ہیں کہ جو چاہے ان کے ساتھ زیادتی اور ظلم کا معاملہ کر جائے اور وہ بیٹھے رہ جائیں۔ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ـــــ اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جان لیجئے کہ ہمارے دین کا مزاج یہ ہے کہ وہ پورے نظامِ اجتماعی کو درست کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا دنیا میں جب بھی نظامِ عدل و قسط قائم ہو گا تو وہ کامیابی سے چل ہی نہیں سکتا جب تک کہ مجرموں، ظالموں، زیادتی کرنے والوں کو سزا نہ دی جائے۔ عدل و قسط کا تقاضا یہی ہے۔ عفو اور معافی کی بنیاد پر کوئی اجتماعی نظام نہیں چل سکتا۔ عفو اور معافی کی بنیاد پر انسان کی اپنی ذاتی روحانیت میں ترفع ہو سکتا ہے۔ بلندی ہو سکتی ہے۔ ایک شخص انتقام اور بدلہ لینے پر قادر ہے لیکن پھر بھی وہ معاف کر دے تو یقیناً اس کی روحانی ترقی ہو گی۔ لیکن اجتماعی نظام اس اصول پر نہیں چلے گا۔ یہ دو چیزیں بظاہر متضاد ہیں، ان پر غور کیجئے۔ قرآن مجید ایک طرف انتہائی زور دیتا ہے کہ معاف کرو، درگزر کرو: اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ۝ اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی ہی کئے جاؤ یا کم از کم بُرائی سے درگزر کرو (تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے چونکہ) اللہ بھی تو بڑا معاف کرنے والا ہے حالانکہ وہ (سزا دینے پر) قدرت رکھتا ہے"۔ ایک مقام پر فرمایا: وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ "اگر تم معاف کر دیا کرو، اگر تم درگذر کر دیا کرو، اگر تم بخش دیا کرو تو اللہ بھی تو غفور رحیم ہے"۔ اس سے زیادہ زوردار اپیل کوئی اور ہو سکتی ہے کہ تمہیں بھی احتیاج ہے کہ نہیں کہ تمہیں بھی اللہ معاف کرے۔ لہٰذا تم بھی اپنے بھائیوں کو معاف کرو، انسانوں سے درگزر کرو، اللہ تم سے درگزر کرے گا۔ اس سے زیادہ زوردار عفو کی ترغیب کا اور کوئی انداز نہیں ہو سکتا ـــــ اب سورۂ بقرہ کی یہ

آیت ذہن میں لائیے : وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَاب ۔ "ہوشمندو تمہارے لئے زندگی قصاص میں ہے ، بدلے میں ہے" ـــــ دنیا کا نظام بگڑ جائے گا اگر عفو ہی عفو ہو۔ مجرموں کے حوصلے بڑھتے چلے جائیں گے۔ ایک مجرم کو معاف کر دیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ اگلے پر ہاتھ اٹھائے۔ اور اگر اسے بدلہ ملے جو تورات کا قانون ہے جسے قرآن مجید نے کھول دیا ہے۔ سورہ مائدہ میں فرمایا : وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ "اور ہم نے تورات میں یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان ، آنکھ کے بدلے آنکھ ، ناک کے بدلے ناک ، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لئے برابر کا بدلہ" ـــــ اس قانون پر عمل ہو تو مفسدوں اور شرپسندوں کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔ ایک کو سزا مل جائے گی تو ہزاروں کی آنکھیں کھل جائیں گی ، ان کو عبرت حاصل ہو جائے گی ـــ یہ ہے نظام کو درست کرنے کی ضرورت۔ چونکہ یہ سورہ اقامتِ دین کی سورہ ہے۔ لہٰذا یہاں نظام کو صحیح و درست رکھنے کے اصول بتائے گئے ہیں ۔ جہاں صرف دعوت و تبلیغ کی بات ہو گی وہاں بتایا جائے گا کہ معاف کرو ، لوگ تمہیں گالیاں دیں تم انہیں دعائیں دو۔ لوگ تم پر پتھراؤ کریں تم ان کی خدمت میں پھول پیش کرو ۔ ایک مرحلہ یہ بھی ہوتا ہے ، اس کا موقع ، اور وقت بھی ہے۔ اور ایک مرحلہ وہ ہے کہ نظامِ عدل و قسط قائم کرنے کے لئے باضابطہ میدان میں آکر مقابلہ کرو ـ وہ نظام قائم ہو گا تو اس میں تعزیرات بھی ہیں ، حدود بھی ہیں ، سزائیں بھی ہیں ، بدلے بھی ہیں ، جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیعتِ خلافت کے بعد جو پہلا خطبہ دیا اس میں یہ الفاظ آتے ہیں " لوگو ! تم میں سے ہر قوی میرے نزدیک ضعیف ہو گا جب تک کہ اس سے حق وصول نہ کر لوں اور ہر ضعیف میرے نزدیک قوی رہے گا جب تک کہ اس کا حق اس کو نہ دلوا دوں " اسلام کے نظامِ عدل و قسط میں قصاص اور بدلے کے قوانین کی اس قدر اہمیت اہمیت ہے ـــــ غور کیجیے کہ یہ سورہ مبارکہ مکی ہے اور مکی دور میں تو بدلے اور انتقام کی اجازت ہی نہیں تھی۔ پھر یہ مضمون یہاں کیوں آرہا ہے ؟ میرا سوال سمجھ میں آگیا ہو گا ۔ یہ مضمون یہاں اس لئے آرہا ہے کہ پیشِ نظر یہ رہے کہ نظام یہی قائم کرنا ہے کہ بدلہ لینا ہے۔ اس وقت ہاتھ بندھے ہوئے ہیں بندھے رہیں لیکن اندر ہی اندر لاوا کھولتا رہے کہ جب بھی ہاتھ کھول دیئے جائیں گے تو یہ جماعت میدان میں آکر باطل کو للکارنے کے لئے

تیار و مستعد ہو ــــــ اور اگر ان کو بنا ہی دیا جائے بدھ مت کے بھکشو ۔ تو وہ میدان میں آنے کا حوصلہ کیسے کریں گے ! پھر ان کا مزاج ان خطوط پر پرورش ہی کہاں پائے گا۔ یہاں تو ضرورت اس امر کی ہے کہ سینوں میں آگ سلگتی رہے : وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ــــ رکے ہوئے اس لئے ہیں کہ ابھی اس کی اجازت نہیں ہے ۔ یہ ڈسپلن کی انتہا ہے کہ ماریں کھاؤ لیکن مدافعت میں بھی ہاتھ نہ اٹھاؤ ــــ لیکن نہ سمجھو کہ بدلہ ہے ہی نہیں ، بدلہ ہے مگر یہ کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے

ابھی نہ چھیڑ محبت کے راگ اے مطرب ابھی حیات کا ماحول سازگار نہیں

اور علامہ اقبال نے کہا ہے ؂

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا حتیٰ کہ وہ وقت آیا جب ہاتھ کھول دیئے گئے ۔ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝ "آج سے انہیں اجازت دی جا رہی ہے جن پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے ، اب ان کو اجازت ہے کہ وہ جنگ کریں ، بدلہ لیں اور بالیقین اللہ ان کی مدد پر قادر ہے ۔" مزاج تو بن گیا تھا ۔ یہ بات ہے اس آیت کے پیش منظر میں : وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝

برائی کا بدلہ لینے کی اجازت

آگے چلتے فرمایا : وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ "اور برائی کا بدلہ تو برائی ہی ہے ، ویسی ہی برائی " وہی بات جو سورۂ مائدہ کی آیت کے حوالے سے میں نے آپ کو بتائی تھی کہ آنکھ کے بدلے آنکھ ، ناک کے بدلے ناک ، کان کے بدلے کان ، دانت کے بدلے دانت اور جیسا زخم لگایا گیا ویسا ہی زخم ۔ یہ ہے قصاص کا قانون ۔ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ یہاں جو دوسرا سَيِّئَة ہے وہ بیان کے لئے ہے وہ برائی ہے ہی نہیں ۔ بدلے میں اگر کسی کا دانت توڑا جائے تو یہ برائی نہیں ہے لیکن چونکہ ظاہری مشارکت ہے دونوں کاموں کی شکل ایک ہی ہے ۔ کسی نے کسی کا دانت توڑا اس نے قصاص میں اس کا بھی دانت توڑ دیا تو درحقیقت یہ سیئہ نہیں ہے ۔ اس فعل کی ظاہری مشارکت کی وجہ سے لفظ سیئہ استعمال ہوا ۔

عفو کی ترغیب

اسی آیت میں آگے فرمایا : فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ "ہاں جو برائی کا بدلہ برائی سے لینے پر قادر ہونے کے باوجود معاف کر دے

اور اصلاح کی کوشش کرتا رہے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے ___ انفرادی سطح پر واقعتاً یہ عمل روحانی ترفع کا ذریعہ بنتا ہے۔ آیت کے آخر میں فرمایا: اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ یقیناً اللہ تعالیٰ کو ظالم لوگ پسند نہیں ہیں ___ برائی کا بدلہ لینے اور برائی کی سزا دینے کا ضابطہ اس کی شانِ عدل کا مظہر ہے۔

بدلہ لینے پر کوئی ملامت نہیں

آگے چلئے، اگلی آیت میں فرمایا: وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ "اور جو کوئی اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیتا ہے اس پر ملامت کا کوئی راستہ نہیں ہے" ___ یہاں پھر دیکھئے کہ رہبانیت اور بدھ مت کے بھکشوؤں کے تصور کو جڑ سے کاٹا جا رہا ہے۔ اگر کوئی بدلہ لے رہا ہے تو کوئی برائی نہیں ہے۔ اسے کسی قسم کی ملامت نہیں کی جا سکتی کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ ضرور معاف کر دے اور بدلہ نہ لے یہ اچھا کام نہیں ہے نہیں! بدلہ اس کا حق ہے جس کے ساتھ برائی کی جائے ___ وہی بات جو sex کے بارے میں سورۃ مومنون اور سورۃ معارج میں کہی گئی تھی کہ جو لوگ اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر اندر رہیں۔ اپنی جنسی خواہش اور اس کے داعیہ کو جائز طریقہ سے پورا کریں تو ان کے لئے کوئی ملامت نہیں: وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ یہ جنس فی نفسہٖ کوئی شر نہیں ہے، یہ جذبہ اللہ نے رکھا ہے، یہ داعیہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں ودیعت کیا ہے۔ بقائے نسل اس کی غایت ہے۔ فی نفسہٖ یہ شر نہیں ہے۔ اگر جائز راستے سے انسان اس جذبہ کی تسکین کرتا ہے تو اس پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ یہ انداز اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ بعض مذاہب بالخصوص عیسائیت میں نکاح اور گھر گرہستی کو گھٹیا درجہ کا کام سمجھا جاتا ہے ___ وہی بات یہاں فرمائی گئی ہے کہ جس پر ظلم ہوا ہے وہ اگر بدلہ لے رہا ہے تو کسی ملامت کا کوئی مقام نہیں ہے: وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝

ملامت کے مستوجب ظالم ہیں

اب اگلی آیت پڑھئے، فرمایا: اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ "ہاں ملامت کے مستوجب اور

مستحق تو وہ لوگ ہیں اور پکڑ تو ان کی ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور جو زمین پر ناحق اپنا علو، اپنا اقتدار چاہتے ہیں اور سرکشی کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جن کے لئے دردناک عذاب ہے۔"

صبر اور عفو کی تلقین

اگلی آیت میں فرمایا: وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ "البتہ جو شخص صبر کرے، جھیلے، برداشت کرے تحمّل اختیار کرے اور معاف کر دے تو یہ نہایت باہمت کاموں سے ہے"۔ اب دیکھیے یہ پانچ آیات ۳۹ تا ۴۳ کس موضوع پر ہیں؟ "بدلہ اور بدلہ کی اہمیت" اس کا مقام مدح میں ذکر کیا جانا۔ اس کے خلاف جو تصوّرات و تخیلات ہیں، ان کی مذمّت — یہ نہ سمجھو کہ بدلہ لینے والا کوئی گھٹیا کام کرتا ہے۔ یہ اس کا حق ہے اس پر کوئی ملامت نہیں ہوگی — ہاں یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص بدلے کی قدرت رکھتے ہوئے معاف کر دے تو اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمّہ ہے۔ اللہ اس کو بہتر بدلہ دے گا۔

ہوا کا رُخ

یہ تمام باتیں اس سورۂ مبارکہ میں اس لئے بیان ہوئیں کہ ہوا کا رُخ پہچان لیا جائے اور اچھی طرح سمجھ لیا جائے کہ توحیدِ عملی کی یہ دعوت کس رُخ پر آگے بڑھے گی۔ جو نظام قائم کرنا اس کا ہدف ہے، وہ کوئی راہبانہ نظام نہیں ہے بلکہ وہ پورا نظام مبنی بر عدل و قسط نظام ہے۔ وہ آیت ہم کل پڑھ چکے ہیں جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوایا گیا: وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ "مجھے حکم ہوا ہے تمہارے مابین عدل کردوں"۔ وہ آیت بھی ہم کل پڑھ چکے ہیں: اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ "اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب بھی نازل کی اور میزان بھی نازل کی"۔ اس میزانِ عدل کو نصب کرو اس کی رُو سے جو مستوجب سزا ہے اسے سزا دو۔

ہدایت و ضلالت کا ضابطہ

اب چند آیات میں زیادہ تشریح کے بغیر پڑھ رہا ہوں۔ ان کے بعد چار آیتیں ہیں کہ جن پر ہمیں کچھ زیادہ وقت لگانا ہوگا۔ فرمایا: وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ "اور جسے اللہ ہی گمراہ کر دے پھر اس کے بعد اس کا کوئی دوست، ساتھی اور مددگار نہیں بن سکتا ہے"۔ یہاں "اللہ ہی گمراہ کر دے" کا کیا مطلب ہے! جس کی گمراہی پر اللہ کی طرف سے مہر ثبت ہو جائے۔ اللہ گمراہ نہیں کیا کرتا۔ انسان خود گمراہ ہوتا ہے۔ ہدایت بھی اللہ تعالیٰ زبردستی

نہیں دیتا۔ ہدایت کے طالب کو اللہ ہدایت دیتا ہے۔ جو گمراہ ہے اور وہ اپنی ضلالت اور کجی کی وجہ سے ایک انتہا تک پہنچ گیا ہے تو وہاں جا کر اس کے دل پر اللہ بھی آخری مہر تصدیق ثبت فرما دیتا ہے کہ اب یہ جائے جدھر گیا۔ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِہٖ جَہَنَّمَ ط وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ■ اب اس نے جو راستہ اختیار کیا ہم نے بھی اس کو اسی کے حوالے کیا اب یہ POINT OF NO RETURN کو پہنچ چکا ہے کہ اس کی واپسی کا کوئی امکان ہی نہیں۔ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ وَعَلٰی سَمْعِہِمْ ط وَعَلٰٓی اَبْصَارِہِمْ غِشَاوَۃٌ ز وَّلَہُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ○ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں کوئی سیدھے راستے پر نہیں لا سکتا۔ اس میں حضورؐ کے لئے دلجوئی ہے کہ آپؐ پریشان نہ ہوں غمگین نہ ہوں۔ آپؐ تشویش نہ رکھیں کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لا رہے ۔۔۔ ان میں سے بہت سے وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہر لگ چکی۔ لہٰذا اب وہ کسی صورت میں بھی پلٹنے والے نہیں ۔۔۔

حسرت بھرا انجام

اسی آیت میں آگے فرمایا: وَتَرَی الظّٰلِمِیْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ یَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰی مَرَدٍّ مِّنْ سَبِیْلٍ ○ "اور تم ان ظالموں کو دیکھو گے جب یہ عذاب دیکھیں گے۔ جہنم جب ان کے سامنے آ جائے گی تو یہ کہیں گے کہ ہے کوئی راستہ لوٹ جانے کا۔ ہے کوئی شکل کہ ہم دنیا میں پھر واپس پہنچ جائیں۔ کوئی اور ایک Chance ملنے کی کوئی صورت ہے کہ نہیں!" هَلْ اِلٰی مَرَدٍّ مِّنْ سَبِیْلٍ ۔۔۔

اگلی آیت میں فرمایا: وَتَرٰىهُمْ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا خٰشِعِیْنَ مِنَ الذُّلِّ یَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِیٍّ ط ایسے لوگوں کا الفاظ میں نقشہ کھینچ دیا گیا ہے۔ "اور تم دیکھو گے ان کو وہ جہنم کی آگ پر پیش کئے جائیں گے۔ ذلت ان پر مسلط ہو چکی ہو گی۔ نگاہیں ان کی زمین پر گڑی ہوں گی۔ ان کو نظر آ رہا ہو گا اپنا انجام۔ یہ ہے وہ جہنم جس میں ہم جھونکے جانے والے ہیں۔ جو ذلت و پشیمانی اور رسوائی ان پر چھائی ہوئی ہو گی اس کی وجہ سے ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی۔ خٰشِعِیْنَ مِنَ الذُّلِّ یَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِیٍّ ط ۔۔۔ مجرم ضمیر انسان کو آپ نے کبھی دیکھا ہو تو آپ کو تجربہ ہو گا کہ انسان آنکھ اٹھا کر اور آنکھ ملا کر کبھی نہیں دیکھتا وہ آنکھوں کے کونوں سے دیکھتا ہے۔ لہٰذا یہ ظالم جہنم کو نگاہ کے گوشے سے دیکھ رہے ہوں گے ان میں اتنی جرأت نہیں ہو گی کہ نگاہ بھر کر دیکھ سکیں کہ اب یہ جہنم ہی ہمیشہ کے لئے ہمارا ملجا و ماویٰ ہے۔

اہلِ ایمان کی طرف سے اظہارِ تأسف

اسی آیت میں آگے فرمایا: وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اور اہلِ ایمان کہیں گے۔ ان کے اس کہنے میں تأسف کا انداز ہوگا ــــ کہ یہ لوگ ہیں اصل خسارے میں جنہوں نے اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو قیامت کے دن خسارے میں مبتلا کیا۔ یعنی دنیا میں تو ہمیں طعنے ملتے تھے۔ تمہاری مت ماری گئی ہے تم دیوانے ہو۔ تم FANATIC ہو گئے ہو۔ تمہیں اپنے مستقبل کا کوئی خیال نہیں ہے۔ تمہیں اپنے نفع نقصان کی کوئی فکر نہیں ہے۔ یہ طعنے آج بھی ان لوگوں کو ملتے ہیں جو دین پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ کو بھی یہ طعنے ملتے تھے: غَرَّ هٰٓؤُلَاۗءِ دِيْنُهُمْ ۭ منافقینِ مدینہ مخلصین مومنین کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ ان کے دین نے ان کی مت ماری ہے۔ ان کو دھوکے میں مبتلا کر دیا ہے۔ انہیں اپنے نفع نقصان کی فکر ہی نہیں۔ ان کا دماغ خراب ہوا ہے۔ یہ چلے ہیں قیصرِ روم کے ساتھ جنگ کرنے! ع بازی بازی باریش بابا ہم بازی ــــ اب تک تو جو عرب کے اندر ہی جنگ تھی۔ ایک کے مقابلے میں تین۔ بدر میں یہی تناسب تھا۔ احد میں بھی ابتدا میں ایک اور تین کی نسبت تھی۔ بعد میں جب رئیس المنافقین عبداللہ ابنِ ابی اپنے آدمی لے کر واپس آ گیا تو ایک اور چار کی نسبت رہ گئی۔ ابھی تک تو زیادہ سے زیادہ ایک اور دس کا تناسب رہا ہوگا۔ اس سے زیادہ تو نہیں۔ کہاں سلطنتِ روما۔ وقت کی عظیم ترین مملکت۔ اسے حال ہی میں سلطنتِ کسریٰ کے خلاف بہت بڑی فتح حاصل ہوئی ہے۔ اور ان کا MORALE بہت اونچا ہے۔ منافقین کہا کرتے تھے کہ ان کی تو عقلیں ماری گئی ہیں۔ انہیں کچھ نظر نہیں آ رہا۔ یہ اپنے دینی جوش میں اندھے ہو گئے ہیں۔ غَرَّ هٰٓؤُلَاۗءِ دِيْنُهُمْ۔ قیامت کے روز یہی مومنین کہیں گے کہ اصل میں اندھے ہم نہیں یہ ہو گئے تھے۔ جیسے سورہ نٓ میں فرمایا: فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۝ بِاَيِّيكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝ اے نبی عنقریب آپ بھی دیکھ لیں گے اور یہ بھی دیکھ لیں گے کہ کون بچل گیا تھا۔ کون دیوانہ ہو گیا تھا اور تیرا رب خوب جانتا ہے کہ کون ہیں وہ لوگ جو اس کے راستے سے بھٹک گئے اور کون ہیں جو ہدایت یافتہ ہیں: اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۠ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ ــ پس اہل ایمان کہیں گے: اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ

اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ۔ آگاہ ہو جاؤ یہ ظالم قائم و دائم اور باقی رہنے والے عذاب میں رہیں گے۔

اللہ کی پکڑ سے چھڑانے والا کوئی نہیں ہوگا

اگلی آیت میں فرمایا: وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اور ان کے کوئی مددگار نہ ہوں گے جو اللہ کے مقابلے میں ان کی مدد کر سکیں ___ شفاعت باطلہ کے تمام خیالات و تصوّرات اس روز ہوا ہو جائیں گے۔ اس روز اللہ کی پکڑ سے کون چھڑانیوالا ہے! کون بچانے والا ہے! کون اللہ کے فیصلے کے آڑے آنے والا ہے۔ !وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ___ ___ آیت کے آخر میں فرمایا: وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ۔ آیت کے اس حصّے کی میں پھر وہی ترجمانی کر رہا ہوں جو پہلے کر چکا ہوں کہ جس کی گمراہی پر اللہ کی طرف سے مہرِ تصدیق ثبت ہو چکی ہو۔ اب اس کے لئے کوئی راستہ نہیں۔

اللہ کی پکار پر لبیک کہنے کی ترغیب اور اعراض پر انذار

اب جو آیات آ رہی ہیں وہ بہت اہم ہیں۔ یہ گویا پورے سلسلۂ درس کی تقریر کل اور آج کے درس کا خلاصہ ہوگا۔ جو آپ کے سامنے آ جائے گا۔ ہم نے کل سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ سے آیت نمبر ۲۱ تک کل نو آیات کا مطالعہ کیا تھا اور آج کے درس میں اب تک ہم آیت نمبر ۳۶ سے ۴۶ تک یعنی گیارہ آیات کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس سورۂ مبارکہ میں اب تک فعل امر ایک ہی آیا ہے: اَقِيْمُوا الدِّيْنَ "دین کو قائم کر دیا قائم رکھو" ___

پکار

اب فعل امر میں ایک پکار، ایک صدا، ایک دعوت آ رہی ہے۔ فرمایا:

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ

"اے سننے والو! اے قرآن کے پڑھنے والو! اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام لیواؤ! لبیک کہو اپنے رب کی پکار پر" ___ اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ۔

دیکھئے یہ لفظ ایک دوسرے صیغے میں پہلے آیت نمبر ۳۸ میں آ چکا ہے جس کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں: وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ۔ وہاں تو اہل ایمان کی تعریف

کے طور پر آیا تھا۔ یہاں ایک عمومی پکار ہے۔ ان کو بھی پکارا جا رہا ہے۔ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ لیکن ان کے متعلق پہلے ہی بتایا گیا کہ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ۔ انہوں نے تو اللہ کی پکار پر لبیک کہا۔ انہوں نے اپنی گردنیں کٹوا دیں۔ انہوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

انذار لیکن اب یہ سمجھیے کہ اس آیت کا مخاطب میں ہوں اور آپ سب بھی اس کے مخاطب ہیں جو درس میں شریک ہیں: اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَىِٕذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ۝ لبیک کہو اپنے رب کی پکار پر، مانو اپنے رب کے مطالبے کو، کمر کس لو اپنی اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لئے: اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ۔ اس سے پہلے پہلے کہ وہ دن آدھمکے کہ پھر کوئی اس دن کو لوٹانے والا نہ ہوا اللہ کو۔ جب قیامت کی گھڑی آجائے گی۔ تو اس کو لوٹانے والا اور ٹالنے والا کوئی نہ ہوگا۔ یہاں جو 'مِنَ اللّٰهِ' آیا ہے تو اس کا تعلق یوم سے ہے۔ اللہ کی طرف سے جب وہ دن آدھمکے لَا مَرَدَّ لَهٗ تو اس کو لوٹانے والا کوئی نہیں۔ قیامت کی گھڑی جب آئے گی وہ ٹالی نہ جائے گی اور جیسا کہ میں نے کل عرض کیا کہ ایک چھوٹی قیامت بھی تو ہے۔ میں نے غالباً جگر مراد آبادی کا شعر بھی سنایا تھا۔ جس کا مصرع ثانی ہے ؏

دنیا سے قیامت دور سہی دنیا کی قیامت دور نہیں

ایک تو بڑی قیامت آئے گی جس میں کائنات کا یہ سلسلہ تمام کا تمام درہم برہم ہو جائے گا اور ایک قیامت انفرادی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ "جو مر گیا اس کی قیامت تو قائم ہو گئی"۔ تو اس سے پہلے پہلے کہ یہ دنیا کی قیامت آجائے۔ جس کے متعلق سورۂ منافقون کے آخر میں فرمایا: وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَاۗءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ جب کسی کے لئے موت کا معین وقت آجائے گا تو اللہ تعالیٰ اُسے ہرگز مؤخر نہیں

کرے گا۔

آیت زیرِ درس کے آخر میں فرمایا: مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ۝ "اس دن تمہارے لئے نہ کوئی پناہ گاہ ہوگی اور نہ اس دن تمہاری طرف سے کوئی انکار ہو سکے گا۔ اور نہ ہی تمہاری طرف سے کوئی پوچھ گچھ کرنے والا ہو گا۔ نکیر کے یہ دونوں ترجمے کئے گئے ہیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ اگر کبھی آپ کے کسی عزیز یا واقف کار کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہو تو آپ جا کر پوچھ گچھ کرتے ہیں کہ اس کو کیوں پکڑا ہے! اس کا کیا جرم ہے، اس نے کیا خطا کی ہے! لیکن وہاں یعنی روزِ قیامت کوئی نہیں ہوگا۔ جو جا کر پوچھ گچھ کر سکے۔ اس دنیا میں بعض ممالک کے بارے میں بھی یہ سننے میں آیا ہے کہ وہاں اگر پولیس کسی کو پکڑ کر لے جائے تو وہاں کوئی پولیس کے پاس جا کر یہ پوچھنے کی جرأت نہیں کرتا کہ اس کو کیوں پکڑا ہے۔ اس لئے کہ جو پوچھنے جائے گا اسے بھی دھر لیا جائے گا۔ ایسا نظام بھی بالفعل دنیا میں ہے بعض اسلامی ممالک میں ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ ایسا نظام صرف روس یا بعض کمیونسٹ ممالک میں ہے ــــ تو یہاں "نکیر" یہ مفہوم بھی دے رہا ہے کہ کوئی پوچھ نہ سکے گا کہ اس کو پکڑا ہے تو کیوں پکڑا ہے ــــ تو یہاں متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اس سے پہلے پہلے کہ وہ دن آ جائے کہ جس کا نہ لوٹنا ممکن ہو، نہ اس روز کسی کو کوئی جائے پناہ میسر آئے۔ نہ کوئی انکار کر سکے، نہ اُن کی طرف سے کوئی پوچھ گچھ کرنے والا ہو اپنے رب کی پکار پر لبیک کہو: اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ۔

اگلی آیت میں خطاب کا رُخ ہو گیا حضورؐ کی طرف۔ بڑا پیارا انداز ہے۔ فرمایا: فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ط ــ اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر یہ سب کچھ سن لینے کے بعد بھی یہ لوگ اعراض کریں، سب کچھ پی جائیں ٹس سے مس نہ ہوں تو آپؐ ملول نہ ہوں، غمگین نہ ہوں۔ ہم نے آپؐ کو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا ــــ یہ تو انسان کا اپنا فیصلہ ہے۔ : اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا۔ آپؐ کا کام ہے ہدایت کی راہ کھول دینا اور دکھا دینا۔ آپؐ کا کام ہے ذمہ داریوں کو بیان اور واضح کر دینا۔ آپؐ کا فرضِ منصبی ہے حق کو مبرہن کر دینا۔ واشگاف کر دینا۔ آپؐ کے ذمہ ہے ابلاغ اور تبلیغ کا حق ادا کرنا۔ اس مضمون کو آیت کے اگلے حصہ میں بیان کر دیا گیا: اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ط آپؐ نے یہ سب کچھ جب بیان کر دیا پھر بھی وہ اعراض کر رہے ہیں۔ آپؐ نے ہماری پکار لوگوں تک پہنچا دی۔ پکار تو اللہ کی ہے اسے حضورؐ اپنی زبانِ مبارک سے ادا فرما رہے ہیں

جیسے کل میں نے اذان کے بارے میں کہا تھا۔ بظاہر تو وہ مؤذن کی زبان سے نکل رہی ہے۔ ہے تو وہ اللہ کی پکار ـــ میں نے اس ضمن میں علامہ اقبال کا یہ شعر سنایا ہے ؎

نکلی تو لبِ اقبال سے ہے کیا جانئے کس کی ہے یہ صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی دل محفل کا تڑپا بھی گئی!!!

آواز کسی اور کی ہے لیکن پکار کسی اور کی ہے تو اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ پکار ہماری ہے: اِسْتَجِیْبُوْا لِرَبِّکُمْ ۔ ادا آپؐ کی زبان سے ہو رہی ہے۔ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰکَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا ؕ اِنْ عَلَیْکَ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ یہ لوگ پھر بھی نہ مانیں پیٹھ دکھائیں تو آپؐ قطعاً ملول نہ ہوں۔ آپؐ نے اپنا فرض ادا کر دیا ـــ سورہ غاشیہ میں اسی بات کو اس اسلوب سے بیان کیا گیا: فَذَکِّرْ ۟ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَکِّرٌ ۟ لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ ۟ "پس اے نبی آپؐ یاد دہانی کراتے رہیے۔ آپؐ تو بس نصیحت ہی کرنے والے ہیں۔ ان پر داروغہ نہیں ہیں (کہ ان کو لازماً راہِ راست پر لے آئیں گے)

اللہ کی پکار پر لبیک کہنے کے موانعات

اگلی آیات میں پھر ایک دوسرے دل نشین اسلوب سے ان موانعات کا ذکر ہے جو انسان کو اللہ کی پکار پر لبیک کہنے سے روکتے ہیں۔ شاید کسی کے پاؤں میں پڑی ہوئی یہ بیڑیاں کھل جائیں۔ کسی کو شعور حاصل ہو جائے۔ کوئی خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائے۔ فرمایا: وَاِنَّآ اِذَآ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ انسان بڑا تھڑدلا ہے، بہت کم ہمت ہے۔ جب ہم اسے اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں ـــ آسائش ہے، دولت ہے، آرام ہے، ثروت ہے، دنیا کی نعمتیں جمع ہو گئی ہیں تو: فَرِحَ بِهَا ۔ اترانے لگتا ہے۔ اکڑنے لگتا ہے۔ پھولے نہیں سماتا لیکن: وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ اور اگر کہیں کوئی تکلیف آ گئی، کوئی مصیبت آ گئی اور وہ آتی ہے ان کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے تو فَاِنَّ الْاِنْسَانَ کَفُوْرٌ ۟ انسان بالکل ناشکرا ہو جاتا ہے۔ ہمت بھی ٹوٹ گئی، حوصلہ ہار بیٹھتا۔ اعتدال کی روش اختیار نہیں کرتا۔ جو انسان طالبِ دنیا ہوتا ہے وہ NORMAL نہیں رہتا۔ دنیا مل گئی تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہے۔ پاؤں زمین پر ٹک نہیں رہے۔ گردن اکڑی ہوئی ہے اور جب ذرا دنیا چھن گئی، تنگی آ گئی تو بجھ کر رہ جاتا ہے، کوئی ہمت نہیں کوئی ولولہ نہیں۔ خودکشیاں ہو جاتی ہیں۔ تو یہ انتہائیں دنیا میں عموماً نظر آتی ہیں ـــ ایک

طرف تو یہ حال ہے، دوسری طرف ایک اور بات ۔ وہی بات جہاں سے آج کی بات شروع ہوئی تھی۔ فَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَمَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ج جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا یہ تنے کا سامان ہے" یہاں اس سر و سامان میں سے ایک خاص بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ دیکھو انسان کو اولاد بہت پیاری ہے۔ دولت پیاری اور اولاد پیاری ۔ لیکن کیا اولاد کے ضمن میں کسی کے ہاتھ میں اختیار ہے! اللہ ہی کے ہاتھ میں اس کا فیصلہ ہے۔ فرمایا: لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط آسمانوں اور زمین کا کل اختیار، اس کی بادشاہی اللہ ہی کے لئے ہے۔ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ط وہ جو چاہتا ہے تخلیق فرماتا ہے۔ آپ کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہیں۔ رحم مادر میں کیا چیز پروان چڑھ رہی ہے۔ آپ کو کچھ پتہ نہیں۔ یہاں بالکل اللہ ہی کا اختیار کار فرما ہوتا ہے۔ یَھَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا " وہ جس کو چاہتا ہے بیٹیاں ہی بیٹیاں دیتے چلا جاتا ہے، وہ مطلقاً با اختیار ہے۔ اس سے پوچھنے والا کوئی نہیں۔ اگلی آیت میں فرمایا: اَوْ یُزَوِّجُھُمْ ذُکْرَانًا وَّاِنَاثًا ج یا کسی کے لئے جوڑے جوڑے کر دیتا ہے۔ بیٹے بھی اور بیٹیاں بھی"۔ وَیَجْعَلُ مَنْ یَّشَآءُ عَقِیْمًا ط اور جس کو چاہتا ہے بانجھ بنا کر رکھ دیتا ہے" کوئی اولاد نہیں تڑپ رہے ہیں"۔ معلوم ہوا کہ یہ مال اور اولاد یہ ہیں دنیا کے سب سے بڑے فتنے۔ اِنَّمَآ اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ ۔ یہ مال اور اولاد ہی تو تمہارے لئے سب سے بڑی آزمائش ہیں۔ کوئی ہے جو یہ کہہ سکے کہ اولاد میرے اختیار میں ہے۔ میری محنت سے اولاد ہو سکتی ہے۔ اللہ چاہے تو بانجھ بنا دے۔ لاکھ جتن کر لے کہ اولاد ہو جائے لیکن نہیں ہو سکتی اگر اللہ نہ چاہے۔ اللہ چاہے تو بیٹیاں یا بیٹے دیتا چلا جائے۔ اللہ چاہے تو بیٹے بھی دے اور بیٹیاں بھی۔ ایک متوازن خاندان وجود میں آ جائے۔ اسی بات میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ مال و دولت دنیوی بھی بالکلیہ ہمارے اختیار میں ہے۔ اس میں تمہیں کچھ دھوکہ لاحق ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ جتنی محنت زیادہ کرو گے اتنا ہی زیادہ کما لو گے۔ جتنی بے ایمانی کرو گے اتنا ہی شاید تمہیں زیادہ مل جائے گا۔ یہ مغالطے اور دھوکے ہیں جو تم کو لگ گئے ہیں۔ یہ بھی اللہ کی طرف سے معین ہے۔ کوئی شخص اپنی مقررہ روزی میں اضافہ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا جب دنیا کے تمام معاملات کا یہی مسئلہ ہے تو انسان کو یکسو ہو کر ان چیزوں کو اللہ کے حوالے کر کے اور انہیں صرف متاعِ دنیا سمجھ کر اپنی توانائیاں، اپنی قوتیں، اپنی صلاحیتیں ان کا اکثر و بیشتر حصہ اقامتِ دین کے

جد وجہد کے لئے کھپا دینا چاہیئے ـــــ آیت کا اختتام ہوتا ہے ۔ اس پُر جلال اسلوب سے
اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ سب کچھ جاننے والا، تمام قدرت رکھنے والا تو صرف وہی ذات
اقدس وسبحانہٗ ہے ۔ اسی پر تمہارا توکّل، اعتماد اور تکیہ ہونا چاہیئے ۔

ھدیۂ تشکّر

یہ ہے حاصل اور لُبِّ لباب ان آیات کا جو ہم نے آج پڑھیں۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آج میں نے جو ارادہ کیا تھا اس تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ پورا ہوگیا ہے ۔ میں چاہتا تھا کہ ہم آج پندرہ آیات کا مطالعہ مکمل کرلیں ۔ ویسے میں عرض کردوں کہ جو آخری تین آیات رہ گئی ہیں اور اس سورۂ مبارکہ کی جو ابتدائی آٹھ آیات ہیں ۔ ان سے مجھے بڑی دلچسپی ہے ۔ اس سورہ کے آغاز میں بھی وحی کا ذکر ہے اور آخری آیات میں جو مضمون ہے وہ تو میرے بڑے ہی شوق و ذوق والا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے کس کس شکل میں کلام فرماتا ہے اور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے علم اور ایمان کی وحی سے پہلے کیا نوعیت تھی اور اجرائے وحی کے بعد ان کی کیا کیفیت ہوئی ۔ یہ بہت ہی اہم اور دلچسپ موضوعات ہیں لیکن اللہ کو منظور ہوا تو کسی آئندہ نشست میں ان پر گفتگو ہوگی ۔ ان شاء اللہ العزیز ۔

پیغامِ عمل

ہم نے بفضلہٖ تعالیٰ نو اور پندرہ کل چوبیس آیات کا تین دنوں میں مطالعہ مکمل کیا ہے ۔ اس طرح نصف کے لگ بھگ ہم نے یہ سورہ پڑھ لی ہے ۔ ساتھ ہی ہم نے سورۂ زمر، سورۂ مومن اور سورہ حٰمٓ السجدہ کی بھی چند اہم آیات توحیدِ علمی کے ضمن میں پڑھ لی ہیں ۔ اس طرح توحیدِ علمی اور توحیدِ عملی کا اقامتِ دین سے ربط و تعلق واضح طور پر ہمارے سامنے آگیا ہے ۔ اب ہر شخص کا اپنا معاملہ ہے ۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے فرائض اس کے عائد کردہ ۔ پہنچانے کی اوّلین ذمہ داری رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تھی ۔ اللہ تعالیٰ جس کو توفیق دے دے، وہ اس پیغام کو پہنچاتا چلا جائے ـــــ بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً حضورؐ نے ہم کو حکم دیا کہ پہنچاؤ میری جانب سے چاہے ایک ہی آیت ـــــ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے میں نے تین دنوں میں قرآن مجید کی چوبیس آیات آپ تک پہنچائی ہیں ۔ اب عمل کرنا اس کی ذمہ داری آپ پر ہے ۔ کرگزرنا یا نہ کرنا اس کا فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے ۔ پھر یہ کہ عمل کا

ارادہ ہو تو اقامتِ دین کی جدوجہد اور اپنی دیگر دینی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے کس قافلے کے ساتھ جڑیں. کوئی قافلہ موجود ہے کہ نہیں ہے۔ کوئی نیا بنائیں تو کس طرح بنائیں۔ عملی مسائل ہیں۔ یہ ہر شخص کے اپنے سوچنے کی بات ہے۔ میں نے قرآن مجید اور سیرتِ مطہرہ کے معروضی مطالعہ سے اپنی امکانی حد تک اور اپنی استعداد کے مطابق جو کچھ سمجھا ہے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق بھی عطا فرمائی اور ہمت بھی۔ اس کام کو اجتماعی طور پر انجام دینے کے لئے میں نے "تنظیمِ اسلامی" کے نام سے ایک جماعت قائم کی ہوئی ہے۔ باقی یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی قبر میں جانا ہے۔ اور اللہ کی عدالت میں اپنے معاملہ کا خود ہی مواجہہ FACE کرنا ہے۔ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا "ہر شخص کو فرد کی حیثیت سے اللہ کی عدالت میں پیش ہونا ہوگا اور جواب دہی کرنی ہوگی"۔ میں آپ کی طرف سے جواب دہی نہیں کروں گا اور نہ آپ میری طرف سے کریں گے۔ میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں، اس پر چل رہا ہوں — جو چیزیں مشترک ہیں انہیں پیش کر رہا ہوں۔ یہ قرآن میرا نہیں ہے یہ ہم سب کا مشترک سرمایہ ہے۔ یہ ہدایت صرف میرے لئے نہیں ہے ہم سب کے لئے ہے۔ قرآن کا پیغام، توحید کے تقاضے میں نے آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ اب سوچنا، عمل کی راہ تلاش کرنا اور اپنے دینی فرائض کی ادائیگی کی فکر کرنا ہر شخص کی اپنی ذمہ داری ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰانَا اللّٰهُ ۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝

اللّٰهم نور قلوبنا بالایمان واشرح صدورنا للاسلام

اللّٰهم انس وحشتنا فی قبورنا ۔ اللّٰهم ارحمنا بالقرآن

العظیم واجعله لنا اماما ونورا وهدی ورحمة

اللّٰهم ذکرنا منه ما نسینا وعلمنا منه ما جهلنا و

ارزقنا تلاوته آناء اللیل وآناء النهار واجعله

لنا حجة یارب العٰلمین ۝ آمین

سلسلہ اشاعت

تنظیمِ اسلامی

(۱)

قراردادِ تاسیس مع توضیحات

(۲)

شرائط شمولیت اور نظام العمل

(۳)

سرافگندیم

بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرٖىھَا وَ مُرْسٰىھَا

ڈاکٹر اسرار احمد امیرِ محترم کا ایک اہم خطاب

(۴)

مطالباتِ دین

مشتمل بر

• عبادتِ رب • فریضہ شہادت علی الناس
• فریضہ اقامتِ دین

(۵)

رودادِ تنظیم اسلامی حصہ اوّل

(۶)

رودادِ تنظیمِ اسلامی

حصّہ دوم

بشمول خطاب امیر محترم

"تقربِ الی اللہ کے مراتب"

(۷)

تنظیمِ اسلامی کی دعوت

امیر محترم کا خطاب

(۸)

تحریکِ جماعتِ اسلامی - ایک تحقیقی مطالعہ

امیر محترم کی ایک فکر انگیز تصنیف

(۹)

مسلمانوں کے دینی فرائض اور اسوہ رسولؐ

امیر محترم کا درس اور خطاب

(۱۰)

دینی فرائض کا جامع تصوّر

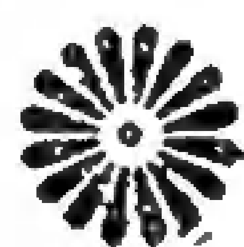
امیرِ محترم کا ایک خطاب

توحیدِ عملی

اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین

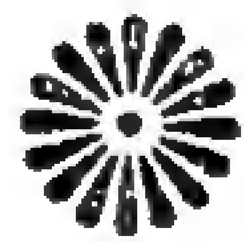
کی اہمیّت و فرضیّت

سورۂ زمر تا سورۂ شوریٰ کی روشنی میں



ڈاکٹر اسرار احمد — امیر تنظیم اسلامی

کا خطاب اور درس قرآن حکیم



ترتیب و تسوید

جمیل الرحمٰن

مکتبہ تنظیمِ اسلامی